Phone 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اپریل 1965

بیادِ اقبال

شائع کردہ

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵۱-بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ : ایک روپیہ

اس کتاب کا برسوں سے انتظار تھا

اسلام کیا ہے

پرویز

ہمارا یہ دعوےٰ ہے (اور مبنی بایمان دعوےٰ) کہ اسلام، نوع انسان کی تمام مشکلات کا حل پیش کرتا ہے۔ لیکن جب یہ پوچھا جاتا ہے کہ اسلام ہے کیا تو مختلف گوشوں سے مختلف آوازیں اٹھتی ہیں جن کا ماحصل نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ کے مسائل سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ اگر اسلام صرف یہی ہے تو اس سے زندگی کے مسائل کا حل نہیں مل سکتا۔

اسلام ایک نظام حیات ہے جس کی بنیادیں چند غیر متبدل تصورات پر قائم ہیں۔ جب تک یہ تصورات واضح طور پر سامنے نہ آئیں، اسلام بہ حیثیت ایک نظام حیات کے سمجھ میں نہیں آسکتا۔ ضرورت تھی کہ ان تصورات کو واضح اور دل کش انداز میں یکجا پیش کیا جائے ——— یہ کتاب اس ضرورت کو پورا کر دیتی ہے۔

کتاب سولہ ۱۶ ابواب پر مشتمل ہے جن میں سے ہر باب مصنف کے مدت العمر کے مطالعہ اور تدبر فی القرآن کا ماحصل پیش کرتا ہے۔ یہ کتاب:

(۱) ہمارے مذہب گزیدہ نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے مطالعہ میں آجائے تو انہیں علیٰ وجہ البصیرت اسلام کا گرویدہ بنا دے۔ اور

(۲) غیر مسلموں کے ہاتھ میں دیدی جائے تو اسلام کے متعلق ان کی غلط فہمیاں دور ہو جائیں۔

کتاب قریب پونے چار سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اور دو اقسام میں شائع کی گئی ہے۔

قسم اوّل۔ اعلیٰ سفید کاغذ۔ مضبوط جلد۔ حسین گرد پوش۔ قیمت فی جلد۔ آٹھ روپے۔

قسم دوم۔ مکینیکل پیپر۔ پیس بورڈ کور۔ قیمت فی جلد۔ چار روپے۔

فرمائش کے ساتھ اس کی تصریح کر دی جائے کہ کونسی قسم کی جلد مطلوب ہے۔

ملنے کا پتہ۔ **ادارہ طلوع اسلام ۔ ۲۵/بی۔ گلبرگ۔ لاہور**

قرآنی نظامِ ربوبیّت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدلِ اشتراک
پاک و ہند سے
سالانہ ـــــ دس روپے
غیر ممالک سے
سالانہ ـــــ ایک پونڈ

قیمت فی پرچہ
پاک و ہند سے
ایک روپیہ

ٹیلیفون نمبر ۸۰۰۰
خط و کتابت کا پتہ
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام
۲۵/بی ـ گلبرگ ـ لاہور

جلد ۱۸ — اپریل ۱۹۶۵ء — نمبر (۴)

فہرستِ مضامین

لمعات ـــــــــ ۲
ایک طاہرہ بیٹی کا خط ـــــــــ ۹
طلوعِ اسلام کالج ـــــ (شیخ سراج الحق) ـــــ ۱۳
ہم عید الفطر کیوں مناتے ہیں؟ ـــــ (محترم پرویز صاحب) ـــــ ۱۷
قانون کی حکمرانی ـــــ (محترم پرویز صاحب) ـــــ ۳۳
حقائق و عبر ـــ ۱- لاوارثوں کی امداد- ۲- معارف و حقائق- ۳- قرآن سے (معاذ اللہ) مذاق- ۴- سیلِ بے پناہ- ۵- پارٹی بازی کی لعنت- ۶- تضادات- ۷- افرو ایشین کانفرنس- ۸- کانفرنس اور عائلی قوانین- ـــ ۶۵
باب المراسلات ـــــــــ ۷۵
بچوں کا صفحہ ـــــــــ ۷۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

۲۱ اپریل کو "یوم اقبالؒ" قرار پانے کی بنا پر، ہمارے ہاں ایک قومی دن کی حیثیت حاصل ہے۔ یوم اقبالؒ کی اس تقریب پر نہ صرف پاکستان میں، بلکہ بیرون پاکستان بھی بڑی اہم علمی مجالس منعقد ہوتی ہیں۔ اور اس موقع پر اقبالؒ کے پیش کردہ فلسفہ حیات کے مختلف گوشوں پر اظہار خیال ہوتا ہے۔ کہیں اسے ایک عظیم شاعر کی حیثیت سے خراج تحسین پیش کیا جاتا ہے اور کہیں اسے ایک مفکر جلیل کی حیثیت سے منظر عام پر لایا جاتا ہے۔ ان مجالس کے خاتمہ کے بعد ہم مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم نے اپنے مایہ ناز شاعر اور مفکر کا نام روشن کر رکھا ہے اور اسے گوشۂ گمنامی کا شکار نہیں بننے دیا۔

ایک طرف، ہر سال، یہ سب کچھ باقاعدگی سے ہوتا ہے۔ کئی سالوں سے برابر ہو رہا ہے اور آئندہ بھی ہوتا چلا جائے گا۔ لیکن دوسری طرف جب اسی اقبالؒ کے پاکستان کے تصور اور اس کے مستقبل کی تعمیر و تشکیل کا معاملہ سامنے آتا ہے تو ہم یہ سب کچھ نظر انداز کر دیتے ہیں کہ اقبالؒ کے سامنے اس مملکت کا جو نقشہ تھا وہ کس قسم کا تھا۔ ہمارے ہاں کے کئی بزرجمہر اٹھتے ہیں اور اس مملکت کے نظام اور آئینی خاکوں کے متعلق وہ وہ فلسفے بگھارتے اور ایسی ایسی موشگافیاں اور نکتہ آرائیاں سامنے لاتے ہیں کہ اقبالؒ کی روح بھی یقیناً طلسم پیچ و تاب بن کر رہ جاتی ہوگی۔ پاکستان کے نام پر ایک خطۂ زمین حاصل کئے اٹھارہ سال پورے ہو رہے ہیں لیکن ابھی تک ہم یہ تک بھی متعین نہیں کر پائے کہ یہاں کس قسم کا نظام مملکت متشکل ہو۔ اس نظام مملکت میں کس قسم کا رنگ عمل بھرا جائے۔ ہمارے دستور مملکت کا سرچشمہ اور قانون سازی کی اصل و اساس کیا ہو۔

ہمارے نزدیک اقبالؒ کی بنیادی حیثیت ایک حکیم انقلاب کی ہے اور ان کی بصیرت قرآنی نے جہاں صدیوں کے بعد ہمیں از سر نو قرآن کی دعوت انقلاب سے متعارف کیا وہاں اسی دعوت قرآنی کے صدقے میں ہماری جداگانہ مملکت کے حصول و قیام کی منزل کی بھی نشان دہی کی۔ اس لحاظ سے مملکت پاکستان کو تصور اقبال کے ایک جیتے جاگتے شاہکار کی حیثیت حاصل ہونی چاہیئے۔ ہمارے ہاں کے جو قلمکار اسلام اور پاکستان کے ربط باہمی کے خلاف دلائل و براہین کے دریا بہا رہے ہیں اور اس قلمی معرکہ آرائی میں کوشاں ہیں کہ انوکھے علمی اور تاریخی انکشافات سے یہ ثابت کریں کہ پاکستان اور اسلام کے مابین کوئی قابل ذکر رشتہ موجود نہیں، ان پر واضح رہنا چاہیئے کہ اقبالؒ نے جب ہمارے لئے اس جداگانہ مملکت کا مطالبہ کیا تھا تو اس کے ساتھ علیٰ وجہ البصیرت پوری وضاحت سے یہ بھی بتا دیا تھا کہ مسلمانوں کی اس جداگانہ مملکت کے حصول و قیام کی وجہ جواز

کیا ہے اور اس کا مقصود و منتہیٰ کیا ؟ مسلمانوں کے لئے ایک الگ خطۂ زمین کی ضرورت کیوں ہے اور انہوں نے یہاں کس قسم کا نقشہ قائم کرنا ہوگا ؟ اس تاریخی حقیقت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اب کسی شخص کو بھی مملکت پاکستان کی نظریاتی اساس کی تلاش میں سرگردانی کی ضرورت نہیں۔ نظامِ مملکت کی یہ اساس اسی دن سے طے شدہ ہے جب پہلی بار (۱۹۳۰ء میں) گنگ و جمن کے سنگم پر کھڑے ہو کر علامہ اقبال نے مسلم لیگ کے صدارتی خطبہ میں اپنوں اور بیگانوں کے سامنے اس مملکت کے حصول کا مطالبہ پیش کیا تھا۔

۱۹۳۰ء میں علامہ مرحوم نے جب اس برصغیر کی جمہوری آزادی کے تشویشناک نتائج اور ان سے متعلق اندیشہ ہائے دور و دراز کا دوٹوک تجزیہ کیا۔ تو یہاں کے مسلمان اپنی تاریخ کے ایک نازک ترین مقام پر کھڑے تھے۔ ان کے فکر و نظر کی پریشانی انہیں ذلت اور شکست کے ایک جیتے جاگتے جہنم کی طرف کشاں کشاں لئے جا رہی تھی اور مستقبل کے آغوش میں ان کی حرماں نصیبی کا جو ہلاکت انگیز انجام کروٹیں لے رہا تھا اس سے قوم کو بچانے کی کوئی ادنیٰ سبیل بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ قومی زندگی کے اس نازک مرحلہ پر، جبکہ مایوسی اور شکست کے گھٹاٹوپ اندھیرے چاروں طرف مسلط تھے علامہ اقبال کے خطبۂ الہ آباد نے ایک قندیلِ راہ کا کام دیا۔ ان کی نوائے سوز ناک اذانِ سحر ثابت ہوئی اور انہوں نے صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے اس تاریخی خطبے میں یہ حقیقت سمجھائی کہ اس برصغیر کے مسلمانوں کو جادۂ اتحاد و وحدتِ فکر و عمل کے زور پر پوری طرح منظم ہو جانا چاہیئے۔ کیونکہ حالات کا رخ بتا رہا ہے کہ مستقبل قریب میں بڑے خطرناک حالات پیدا ہونے والے ہیں اور یہاں کی ملت اسلامیہ کو ان سے عہدہ برا ہونے کے لئے اپنا جداگانہ محاذ قائم کرنا پڑے گا۔

مردِ مومن کی عقابی نگاہیں جو کچھ دیکھ رہی تھیں وہ واقعی چند ہی سال میں ایک حقیقت بن کر سامنے آ گیا۔ ۱۹۳۷ء میں نئے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت سات صوبوں میں ہندوؤں کا تسلط قائم ہو گیا اور علامہ اقبالؒ نے جن "خطرناک حالات" کی نشان دہی کی تھی وہ واقعی ایک ہولناک حقیقت بن کر سامنے آ گئے۔ چنانچہ انہوں نے سات سال قبل، اپنے اس خطبہ صدارت میں یہ واضح کر دیا تھا کہ

> ہندوستان دنیا میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک مخصوص علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے ....
> اگر یوں ایک مرکزیت قائم کر دی جائے تو یہ نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام ایشیا کی گتھیاں سلجھا دیگا۔

یہ ایک اصولی حل تھا۔ آگے چل کر انہوں نے اپنے خطبہ میں اس کی وضاحت فرمائی اور یہ وضاحت ایک شدت آرزو بن کر یوں لبوں پر آئی۔

> میری آرزو ہے کہ پنجاب صوبہ سرحد سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد ریاست قائم کی جائے ہندوستان کو حکومت خود اختیاری زیر سایہ برطانیہ ملے یا اس سے باہر کچھ بھی ہو مجھے تو یہی نظر آتا ہے

کہ شمالی مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام کم از کم اس علاقہ کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔ (خطبہ صدارت ۔ الہ آباد ۱۹۳۰ء)

اس سلسلے میں انہوں نے مزید کہا کہ

یہ مطالبہ مسلمانوں کی اس دلی خواہش پر مبنی ہے کہ انہیں بھی کہیں اپنی نشوونما کا موقع ملے، اس لئے کہ اس قسم کے مواقع کا حاصل ہونا اس وحدت قومی کے نظام حکومت میں قریب قریب ناممکن ہے جس کا نقشہ ہندو ارباب سیاست اپنے ذہن میں لئے بیٹھے ہیں۔ اور جس سے مقصد وحید یہ ہے کہ تمام ملک پر مستقل طور پر انہیں کا غلبہ اور تسلط ہو۔ (ایضاً)

اسی تاریخی خطبہ صدارت میں انہوں نے اصولی طور پر یہ لائحہ عمل بھی قوم کے سامنے پیش کیا تھا کہ

اگر آج آپ اپنے تمام تصورات اور تخیلات کو اسلام اور صرف اسلام کے نقطۂ ماسکہ پر مرکوز کر دیں اور زندہ و پائندہ اور قائم و دائم نظریۂ حیات سے، جو وہ پیش کرتا ہے، نور بصیرت حاصل کریں تو اس سے آپ اپنی منتشرہ قوتوں کو پھر مجتمع اور گم گشتہ مرکزیت کو از سر نو حاصل کریں گے۔ اور یوں اپنے آپ کو تباہی اور بربادی کے مہیب جہنم سے بچا لیں گے۔ (ایضاً)

لاریب کہ اسلام کے زندہ و پائندہ اور دائم و قائم نظریۂ حیات سے نور بصیرت حاصل کئے بغیر ہماری بگڑی نہیں بن سکتی۔ لیکن اسی مقام پر وہ نازک سوال ابھر کر سامنے آجاتا ہے جس کے علیٰ وجہ البصیرت حل نہ کئے جانے کے باعث ہم فکر و عمل کے شدید الجھاؤ میں مبتلا چلے آرہے ہیں۔ اور وہ سوال یہ ہے کہ فی الصلہ اسلام کیا ہے؟ امت صدیوں سے مختلف فرقوں میں بٹی چلی آرہی ہے۔ ہر فرقے کا اسلام دوسرے فرقے سے مختلف ہے اور ان میں سے ہر فرقہ اس زعم میں مگن ہے کہ اس کا اسلام صحیح اسلام ہے اور باقی سب کا غلط۔ اس صورت حال کی موجودگی میں مذکورہ سوال کی اہمیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ علامہ اقبالؒ جب پاکستان کی جداگانہ مملکت کا تصور پیش کر رہے تھے تو وہ اس سوال کی اہمیت سے پوری طرح باخبر تھے اور انہوں نے مختلف مواقع پر اس حقیقت کو پوری طرح نکھار کر پیش کیا چنانچہ انہوں نے اپنے خطبات ـــــ تشکیل الٰہیات جدید ـــــ میں فرمایا تھا کہ

اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کُل کی روحانی اساس ازلی اور ابدی ہے۔ لیکن اس کی نمود تغیر و تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے جو معاشرہ حقیقتِ مطلق کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقبل اور تغیر پذیر عناصر میں تطابق و توافق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں اس لئے کہ دنیا میں، جہاں تغیر کا دور دورہ ہے۔ ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے۔

لیکن ابدی اصولوں کے متعلق اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرے میں تغیر کا امکان ہی نہیں — وہ تغیر جسے قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے — تو اس سے زندگی جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے یکسر جامد اور منصلب بن کر رہ جائے گی یورپ کو عمرانی و سیاسی دوائر میں جو ناکامی ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدل اصول حیات نہیں تھے اس کے برعکس گزشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصول تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔

یہ حقیقت کشا حل پیش کرتے ہوئے اس حکیم انقلاب کی نگاہیں اس طبقہ کے ذہنی تاثر سے بے خبر نہیں تھیں جو مسلمانوں کے مختلف فرقوں اور ان کے فقہی اختلافات کی بنا پر یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ ان اختلافات کی موجودگی میں یہ ممکن ہی نہیں کہ اسلام کی کوئی متفق علیہ شکل ایک نظام مملکت کی حیثیت سے نافذ العمل ہو سکے۔ علامہ اقبالؒ ایسے عناصر کی طرح اسلام کے مستقبل سے مایوس نہیں تھے۔ ان کی بصیرت قرآنی امیدوں کی ایک شمع روشن کر رہی تھی اور پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ

مجھے اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ اگر اسلامی قانون سے متعلق ضخیم لٹریچر کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو اس سے دورِ حاضر کے ناقدین کے اس سطحی خیال کی تردید ہو جائے گی کہ اسلامی قانون جامد اور ناقابلِ ترقی ہے بدقسمتی سے ہمارے ہاں کا قدامت پرست طبقہ ابھی اس کے لئے تیار نہیں کہ قانون سازی کے مسئلہ کے متعلق تنقیدی نقطۂ نگاہ سے گفتگو کی جائے۔ اگر کسی نے اس بات کو اٹھایا تو یہ اقدام بہت سے لوگوں کے لئے وجۂ ناراضگی ہو جائے گا اور مخالفت کا دروازہ کھول دے گا۔ (خطبات صـ ۱۵۶)

یہ کام بڑا اہم تھا اور اس کے لئے اقبالؒ ہی کے الفاظ میں ؏

چیتے کا جگر چاہئے۔ شاہین کا تجسس

علامہ اقبالؒ بخوبی سمجھتے تھے کہ اسلام کا مستقبل ایسے داعیٔ انقلاب کا منتظر ہے جو صدیوں کے رطب و یابس کو الگ کر کے دینِ خالص کو اپنی پاکیزہ اور منزہ شکل میں دنیا کے سامنے لے آئے۔ اُسے مخالفتوں کے ہجوم سے ضرور دوچار ہونا پڑے گا لیکن اپنی اس ہمت و جرأت اور قلندرانہ عمل سے وہ نہ صرف امت بلکہ پوری نوعِ انسانی کی تقدیر کو بدل کر رکھ دے گا چنانچہ انہوں نے فرمایا۔

میرا عقیدہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطہ نگاہ سے زمانہ حال کے جورس پروڈنس پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کر دے گا وہی اسلام میں مجدد ہوگا اور بنی نوعِ انسان کا سب سے بڑا محسن بھی وہی ہوگا ...... افسوس ہے کہ زمانۂ حال کے اسلامی فقہاء یا تو زمانہ کے میلانِ طبیعت سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا ...... میری ناقص رائے میں اسلام اس وقت گویا زمانے کی کسوٹی پر

پر کھا جا رہا ہے اور شاید اسلام کی تاریخ میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔

(اقبال نامہ۔ جلد اول صفحہ ۵)

قیام پاکستان کے بعد بالآخر وہ وقت آگیا جبکہ پوری امت سے لڑائی مول لے کر اس سوال کا دوٹوک حل پیش کرنے کی ضرورت تھی، اور یہ سہرا اُسی کے سر بندھ سکتا تھا جو فرقہ بندی کے شرک سے کلیتہً بالاتر ہو اور علیٰ وجہ البصیرت یہ اعلان کر سکے کہ خدا کا دین اپنی مکمل ترین شکل میں کتاب اللہ کے اوراق میں محفوظ ہے اور شمع نورانی کی روشنی سے آنکھیں بند کر کے انسانوں کے خود ساختہ اور ٹمٹماتے ہوئے چراغوں کی روشنی میں دوسری بارگاہوں سے خدا کے دین اور اس کے ابدی حقائق اور مستقل اقدار کی تلاش میں بھٹکتے پھرنا خود منشائے دین سے روگردانی ہے۔ چنانچہ انہوں نے انتہائی واشگاف اور دوٹوک انداز میں اعلان کیا کہ

> یہ سوال زود یا بدیر مسلم اقوام کے سامنے آنے والا ہے کہ اسلامی قوانین شریعت میں ارتقاء کی گنجائش ہے یا نہیں۔ یہ سوال بڑا اہم ہے اور بہت بڑی ذہنی جدوجہد کا متقاضی۔ اس سوال کا جواب یقیناً اثبات میں ہونا چاہیئے بشرطیکہ اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے۔ وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا اور حریت پسند قلب ہے وہ جسے رسول اللہؐ کی حیات طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ ــــــ حسبنا کتاب اللہ۔

(خطبات اقبال)

ان کا یہ اہم اور تاریخی خطبہ حسب ذیل الفاظ پر ختم ہوتا ہے اور یہی وہ پیغام ہے جو اس حکیم الامت کے پورے پیغام کی روح اور منشاء و مقصود ہے۔

> اسلام کا بنیادی تخیل یہ ہے کہ اب وحی کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اس بنا پر ہمیں دنیا کی سب سے زیادہ آزاد قوم ہونا چاہیئے پہلے زمانے کے مسلمان جو ایشیائے قبل از اسلام کی روحانی غلامی سے (دفعتہً) آزاد ہوئے تھے۔ اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ وہ (ختم نبوت کے) بنیادی تخیل کی اہمیت کا صحیح صحیح اندازہ کر سکتے۔ لیکن دور حاضر کے مسلمان کو چاہیئے کہ وہ اپنی پوزیشن کو اچھی طرح سے سمجھے۔ (قرآن کے) غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں اپنے معاشرہ کی تشکیل جدید کرے اور وہ عالمگیر جمہوریت قائم کر کے دکھا دے جو اسلام کی اصل و غایت ہے۔ لیکن جو ابھی تک پورے طور پر بے نقاب ہو کر دنیا کے سامنے نہیں آئی۔

اسلامی مملکت کا منشاء ومقصود

اسلامی نظام مملکت کے قیام سے متعلق اس بنیادی مسئلہ کا یوں نکھرا ہوا حل پیش کرنے کے ساتھ حضرت علامہ نے اس نظام کے منشاء ومقصود کو بھی مختلف مقامات پر بڑی وضاحت سے پیش کیا۔ چنانچہ معرکہ دین ووطن کے سلسلے میں مولانا حسین احمد مدنی مرحوم کے اخباری بیان کو گمراہ کن قرار دیتے ہوئے حسب ذیل الفاظ میں اعلان کرتے ہیں کہ

اگر عالم بشریت کا مقصد اقوام انسانی کا امن، سلامتی اور ان کی موجودہ اجتماعی ہیئتوں کو بدل کر ایک واحد اجتماعی نظام قرار دیا جائے، تو سوائے نظام اسلام کے کوئی اور اجتماعی نظام ذہن میں نہیں آسکتا کیونکہ جو کچھ قرآن سے میری سمجھ میں آیا ہے اسکی رو سے اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح کا داعی نہیں بلکہ عالم بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے جو اس کے قومی اور نسلی نقطہ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے ..... نبوت محمدیہ کی غایت الغایات یہ ہے کہ ہیئت اجتماعیہ انسانیہ قائم کی جائے جس کی تشکیل اس "قانون الٰہی" کے تابع ہو جو نبوت محمدیہ کو بارگاہ الٰہی سے عطا ہوا تھا۔

وحدت انسانیہ کا علمبردار

علامہ مرحوم کے نزدیک اسلام کا نظام جسے پاکستان کی مثالی مملکت میں متشکل کرنا مقصود تھا (اور مقصود ہے) کسی خاص قوم یا نسل سے مخصوص نہیں بلکہ یہ نوع انسانی کی عالمگیر وحدت و اخوت کا داعی اور ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کا علمبردار ہوگا۔ چنانچہ ڈاکٹر نکلسن کے نام انہوں نے اپنے ایک خط میں لکھا کہ

اسلام بلکہ کائنات انسانیہ کا سب سے بڑا دشمن رنگ ونسل کا عقیدہ ہے اور جو لوگ نوع انسانی سے محبت رکھتے ہیں انکا فرض ہے کہ ابلیس کی اس اختراع کے خلاف علم جہاد بلند کریں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ قومیت کا عقیدہ جس کی بنیاد نسل یا جغرافیائی حدود ملک پر ہے دنیائے اسلام میں استیلا کر رہا ہے اور مسلمان عالمگیر اخوت کے نصب العین کو نظرانداز کرکے اس عقیدے کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہیں جو قومیت کو ملک ووطن کی حدود میں مقید رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لئے میں ایک مسلمان اور ہمدرد نوع انسانی کی حیثیت سے انہیں یاد دلانا مناسب سمجھتا ہوں کہ ان کا حقیقی فرض سارے بنی آدم کی نشوو ارتقا ہے۔

معاشی مسئلہ کا حل

انسانی زندگی کے مسائل میں ایک اہم ترین مسئلہ زندگی کے معاشی تقاضوں سے متعلق ہے۔ اقوام عالم کی تقدیریں آج اسی محور پر گردش کر رہی ہیں اور جو ملک اور قوم اس مسئلہ کو اطمینان بخش طور پر حل نہیں کر سکی اقوام عالم میں اسے کوئی باعزت مقام حاصل نہیں اور اسکا اپنا معاشرہ ہر قسم کی پریشانیوں اور تلخیوں سے دوچار ہے۔ ایسی صورت میں یہ سوال ابھر کر سامنے آجاتا ہے کہ اسلام کے جس نظام نے پوری نوع انسانی کو اپنی آغوش رحمت میں لینا ہے، کیا وہ اس مسئلہ کا کوئی ایسا حل پیش کرتا ہے جو (اشتراکیت کی طرح) انسان کو محض ایک مشین بنا کر نہ رکھ دے بلکہ اس کے جسم اور ذات دونوں کے نشوو ارتقا کا سامان مہیا کرے۔ علامہ اقبالؒ کے نزدیک اس سوال کا جواب اثبات میں ہے۔ چنانچہ پورے یقین واعتماد سے وہ قائداعظم کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں ـــــ

یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اسلامی آئین کے پاس اس مسئلہ کا حل موجود ہے۔ اس آئین کو دور حاضرہ کے تصورات کی روشنی میں مزید نشوونما (DEVELOPMENT) دیجا سکتی ہے۔ اسلامی آئین کے طویل اور گہرے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام کو اچھی طرح سے سمجھ کر نافذ کر دیا جائے تو اس سے کم از کم ہر فرد

کو سامانِ پرورش (SUBSISTENCE) ضرور مل جاتا ہے۔

مثالی مملکت ان کے نزدیک جب مملکت کا نظامِ معاشرہ آئینِ خداوندی کے مطابق قائم ہوگا اور برگ و بار لائیگا تو تاریخ انسانی میں وہ ایک مثالی نوعیت کا حامل ہوگا۔ انہوں نے اس کا نقشہ پیش کرتے ہوئے جاوید نامہ میں تمثیلی انداز بیان اختیار کیا ہے۔ وہ اسے "ملکِ خدا داد" کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کے لئے فلکِ مریخ اور مرغدین کا شہر منتخب کرتے ہوئے اس کا حسین و جمیل نقشہ یوں پیش کرتے ہیں۔

ساکنانش در سخن شیریں چو نوش ۔۔۔ خوب روئے و نرم خوئے و سادہ پوش
فکرشاں بے درد و سوزِ اکتساب ۔۔۔ دانہ دانِ کیمیائے آفتاب
خدمت آمد مقصدِ علم و ہنر ۔۔۔ کار ہا را کس نمی سنجد بزر
کس ز دینار و درم آگاہ نیست، ۔۔۔ ایں بتاں را در حرمہا راہ نیست
سخت کش دہقاں چراغش روشن است ۔۔۔ از نہاب دہ خدایاں ایمن است
کشت و کارش بے نزاع آبجوست ۔۔۔ حاصلش بے شرکتِ غیرے از دست
اندراں عالم نہ لشکر نے فنوں ۔۔۔ نے کسے روزی خورد از کشت و خوں
نے قلم در مرغدیں گیرد فروغ ۔۔۔ از فنِ تحریر و تشہیر دروغ
نے بہ بازاراں ز بیکاراں خروش ۔۔۔ نے صدا ہائے گدایاں درد گوش

کس دریں جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

یہ تھا اسلامی مملکت کا وہ دلکش نقشہ جو اس داعیٔ انقلاب کی حسین ترین آرزوؤں کا مرکز و محور تھا۔ اسی کو محسوس و مشہود پیکروں میں متشکل دیکھنے کے لئے انہوں نے اس برصغیر کے مسلمانوں کے لئے جداگانہ مملکت کا مطالبہ کیا تھا۔ ان کی یہ سہانی آرزوئیں (ایک حد تک) اس دن پوری ہوگئیں جب قائداعظمؒ کے تدبر اور فراست سے یہ مملکت واقعی ایک جیتی جاگتی حقیقت بن کر دنیا کے سامنے آگئی۔ لیکن یہ آرزو ابھی بہ تمام و کمال پوری نہیں ہوئی اور اس دن پوری ہوگی جب پاکستان میں قرآن کا مثالی نظام متشکل ہوگا۔ خدا کرے کہ اقبالؒ کی یہ شدتِ آرزو جو پوری ملتِ اسلامیہ اور عالمِ انسانیت کی منزلِ مقصود ہے دولتِ خدا داد پاکستان میں قرآنی نظام کے قیام سے حاصل مراد کو پہنچے۔

ایک طاہرہ بیٹی کا خط

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغِ مردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا

(سلام و احترام کے بعد لکھا ہے)۔

یہ خط آپ کی ایک طاہرہ بیٹی کا ہے۔ کچھ عرصہ ہوا، چند طاہرہ بہنوں نے آپ کو خطوط لکھے تھے جو طلوع اسلام میں شائع ہوئے تھے۔ ان میں چند ایک ایسی جانگداز حقیقتوں کا ذکر کیا گیا تھا جن کا سامنا ہمارے معاشرہ کی بدنصیب لڑکیوں کو کرنا پڑتا ہے۔ محض اس جرم کی پاداش میں کہ وہ لڑکی کیوں ہیں۔ ان میں ایک اور تلخ حقیقت کا بھی اضافہ کر لیجئے۔ اور اس کے بعد بھی یہ نہ سمجھ لیجئے کہ ان بے گناہ مجرموں کی مصیبتوں کی فہرست مکمل ہو گئی ہے۔ اس میں تو ان کی زندگی کے آخری سانس تک اضافہ ہوتا رہے گا۔ بلکہ اس کے بعد بھی، کیونکہ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ جہنم میں بھی اکثریت عورتوں ہی کی ہوگی اور اس کے داروغے کا نام "مالک" ہوگا۔ آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ ہمارے ہاں "مالک" خاوند کو کہا جاتا ہے۔ کیا عربوں میں بھی ایسا ہی تصور تھا؟ بلکہ اس سے بھی بدتر کیونکہ وہاں خاوند کو بعل کہا جاتا تھا۔ اور بعل تو آپ کو معلوم ہے، بہت بڑا خدا تھا۔ انسانوں کا خود ساختہ خدا!

میرا جنم ایک متوسط شریف گھرانے میں ہوا۔ چونکہ خدا کے فضل سے اب ہماری قوم مہذب ہو چکی ہے اس لئے تہذیب کا تقاضا تھا کہ لڑکیوں کو تعلیم دلائی جائے۔ کسی مقصد کو سامنے رکھ کر نہیں بلکہ محض مہذب بن کر دکھانے کے جائیں! میٹرک تک پہنچی تو عمر شادی کے قابل ہو چکی تھی۔ رشتوں کی دیکھ بھال شروع ہوئی تو "ہونے والے مالکوں" نے تعلیم کی شرط لگا دی۔ تعلیم سے ان کی مراد بھی کالج کی تعلیم۔ لہٰذا اب تہذیب کے تقاضے سے نہیں بلکہ اس بوجھ کو کسی نہ کسی طرح سر سے اتارنے کے لئے کالج بھیج دیا گیا۔ جوں جوں تعلیم بڑھتی گئی رشتوں کا میدان سمٹتا گیا۔ کیونکہ ہونے والے مالکوں کا اعتراض ہوتا تھا کہ لڑکی کی عمر زیادہ ہے۔ یعنی انہیں تعلیم چاہئے ایم۔اے تک اور عمر چاہیئے چودہ سال کی! منطق تو اس تقاضے پر ضرور ہنسے گی، لیکن "مالک کی مرضی" کے سامنے منطق کی حیثیت کیا ہے۔ چنانچہ تعلیم جاری رکھی گئی — اب محض اس لئے کہ تعلیم چھوڑ کر حاصل کیا ہوگا؟ — گویا تعلیم دلا کر تو بہت کچھ حاصل ہو چکا ہے۔ اسے چھوڑ کر کیا حاصل ہوگا! بہرحال ایم۔اے کیا۔ اس کے بعد ایڈ بھی کیا — لیکن عمر کی حماقت

دیکھئے کہ وہ بھی تعلیم کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئی۔ اُس جاہل کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ مالک تعلیم زیادہ اور عمر کم مانگتا ہے۔ ایف کر لینے کے بعد تعلیم کی گاڑی کا آخری اسٹیشن آگیا۔ اب ناچار اس سے اترنا پڑا۔ اور اتر کر پلیٹ فارم پر بیٹھ گئی۔ اس لئے کہ اس عمر تک پہنچ کر لڑکی' دھوبی کا کتا بن جاتی ہے ــــ نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔

اب رشتوں کی منڈی میں وہی مال باقی رہ گیا جو بکاؤ نہیں تھا۔ لیکن مال خواہ بکاؤ نہ ہی تھا' ان کا مزاج تو بدستور شاہانہ تھا۔ جس تک بات پہنچائی جاتی وہ ناک بھوں چڑھا کر کہہ دیتا کہ ہاں' تعلیم تو کافی ہے لیکن عمر بہت زیادہ ہے۔ اچھا خیر۔ ہم اس "نقص" کو بھی نظر انداز کر دیں گے' لیکن سوال یہ ہے کہ لڑکی کے ساتھ ملے گا کیا ؟

میں اپنے بدنصیب باپ کی سب سے بڑی بیٹی تھی۔ ابھی تین لڑکیاں اور میرے پیچھے پیچھے اسی راستے پر چلی آرہی تھیں ــــ تعلیم کے ساتھ ساتھ عمر میں بڑھتی ہوئیں۔ متوسط سی آمدنی کا شریف باپ' لڑکیوں کو تعلیم دلائے کہ "ساتھ دینے کے لئے" کوٹھیاں بنوائے اور موٹریں خریدے! لیکن ہونے والے مالکوں کو اس سے کیا غرض ــــ نتیجہ یہ کہ عمر بڑھتی گئی اور رشتوں کی آمد گھٹتی گئی۔ حتیٰ کہ جب میں تیس برس کے لگ بھگ ہو گئی تو پھر یہ سلسلہ ہی ختم ہو گیا۔

شام کو جب ابا جان دفتر سے واپس پر ایک نہایت گہری' حسرت بھری نگاہ مجھ پر ڈالتے ہیں تو میں یہی نگاہ اُن تین معصوموں کی طرف لوٹا دیتی ہوں جو میرے پیچھے پیچھے چلی آرہی ہیں۔ اُس وقت سوچتی ہوں کہ کیسا سہانا تھا وہ زمانہ جب لڑکیوں کو پیدا ہونے کے ساتھ ہی زندہ زمین میں دفن کر دیا جاتا تھا ــــ کیسا اچھا تھا ان تمام مہذب مصیبتوں کا وہ حل' جو عہد جاہلیت کے غیر مہذب انسان نے سوچا تھا !

ہمارے مشفق باپ ! کیا آپ مجھ سے متفق ہیں ؟ اگر متفق ہیں تو کیا آپ کے پاس ان تیروں کے زخموں کا کوئی مرہم ہے جو راستہ چلنے والیوں کی کنکھیوں سے یہ کہتے ہوئے برستے ہیں کہ

یہ ہے وہ جس کے بال سفید ہو چکے ہیں اور ابھی تک باپ

کے سر پر بوجھ بنی بیٹھی ہے !

اور یہ زخم تنہا میرے دل کے نہیں۔ میری جیسی سینکڑوں' ہزاروں' لاکھوں' ناکردہ گنہگاروں کے دل کے ہیں جن کے متعلق (آپ کہا کرتے ہیں کہ قرآن میں ہے کہ) نہ انہیں زندگی نصیب ہوتی ہے نہ موت ہی آتی ہے۔ اور جنہیں اتنی بھی اجازت نہیں کہ وہ ان زخموں کی ناقابلِ برداشت ٹیس پر اونچی آہ بھی کر سکیں۔ آپ کہہ دیں گے کہ غلط معاشرہ میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ لیکن میں اتنا پوچھنا چاہتی ہوں کہ غلط معاشرے میں لڑکیوں ہی کے ساتھ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اور اس کا بالآخر انجام کیا ہوگا۔

میری عزیز بیٹی ! یہ اس لئے کہ غلط معاشرہ کہتے ہی اسے ہیں جس میں مظلوم کے ساتھ اور ظلم ہوتا جائے۔ لڑکی (یا عورت) ہمارے ہاں پہلے سے مظلوم چلی آرہی ہے۔ معاشرہ جس قدر زیادہ غلط ہوتا جائے گا۔ ظلم بڑھتا جائیگا۔ جہاں تک تہذیب اور

جہالت کا تعلق ہے، ہمارا معاشرہ ایسے ہی مہذب ہوا ہے جیسے سرخی اور پوڈر سے چہرے کے بدنما دھبوں کو چھپانے کی ناکام کوشش کی جاتی ہے۔

باقی رہا یہ سوال کہ آخر ان مظالم کا انجام کیا ہوگا۔ سو اس کے متعلق میں اس سے زیادہ اور کیا کہوں کہ

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

دعاگو

(طاہرہ بیٹیوں کا غم زدہ باپ)

ضرورتِ کاتب

ادارہ طلوع اسلام کو ایک ایسے خوشنویس کی ضرورت ہے جو نسخ اور نستعلیق فن کتابت میں مہارت رکھتا ہو۔ خواہش مند حضرات اس کے لئے دفتر ادارہ طلوع اسلام (۲۵/بی گلبرگ لاہور) میں ۹ بجے سے ۳ بجے بعد دوپہر تک براہ راست مل لیں یا دفتر کے ٹیلیفون (نمبر ۸۰۸۰۰) پر رابطہ قائم کریں۔

(ناظم ادارہ)

کراچی میں ادارہ طلوع اسلام کی مطبوعات

کراچی میں ادارہ طلوع اسلام کی شائع کردہ کتب، محترم پرویز صاحب کی مطبوعات اور تحریک کا لٹریچر حسب ذیل پتہ سے مل سکے گا۔

محمد اسلام صاحب نمائندہ بزم طلوع اسلام ۔ ۱۰۰۴ لوئس روڈ بندر روڈ۔ کراچی

علاوہ بریں ہر اتوار کی صبح کو سندھ اسمبلی ہال (بندر روڈ) کراچی میں پرویز صاحب کے درس قرآن کے موقع پر بھی تحریک کا لٹریچر اور ضروری مطبوعات، حسب ضرورت مہیا کی جاتی ہیں۔

کتاب ـــــ قرآنی فیصلے جلد سوئم بھی شائع ہوگئی

اس کتاب کی پہلی دو جلدوں سے آپ نے اس کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ کر لیا ہوگا۔ اب اس کی تیسری جلد کی اشاعت سے ان میں اور اضافہ ہوگیا ہے۔ تیسری جلد کے چیدہ چیدہ عنوانات ملاحظہ فرمایئے۔

۱۔ کمیونزم اور اسلام کا مقابلہ۔
۲۔ کیا سود لینا جائز ہے۔
۳۔ کیا صحابہؓ کے پاس دولت کے انبار تھے؟
۴۔ کیا ذرائع پیداوار قومی ملکیت میں لئے جا سکتے ہیں۔
۵۔ حضرت یوسفؑ نے زمین کا انتظام کس قسم کا کیا تھا۔
۶۔ رہن بالقبضہ کی قرآنی حیثیت کیا ہے۔
۷۔ قرآن کی رُو سے وصیت کا کیا حکم ہے۔
۸۔ کیا یتیم پوتے کو وراثت میں حصہ مل سکتا ہے۔
۹۔ اوقاف کی قرآنی حیثیت کیا ہے۔
۱۰۔ کیا خدمتِ دین کا معاوضہ لینا جائز ہے؟
۱۱۔ اسلامک سوشلزم سے کیا مفہوم ہے۔
۱۲۔ کیا خدا عادل ہے؟
۱۳۔ شریف عورتوں کو چھیڑنے والے
۱۴۔ شراب کے متعلق قرآنی فیصلہ
۱۵۔ کیا غیر مسلموں کے نیک اعمال کا بدلہ ملے گا؟
۱۶۔ تعلق باللہ سے کیا مراد ہے۔
۱۷۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کیا ہیں۔
۱۸۔ عقل اور وحی کا باہمی تعلق کیا ہے۔

یہ اور اس قسم کے اور متعدد سوالات کا جواب، قرآن کریم کی روشنی میں بڑی وضاحت سے پیش کیا گیا ہے۔ عام اشاعت کی غرض سے کتاب کا پیپر ایڈیشن شائع کیا گیا ہے۔ ضخامت تین سو صفحات۔ قیمت تین روپے پیشگی خریداروں میں سے جو احباب کتاب نہ لینا چاہیں وہ اطلاع فرما دیں۔ باقی احباب کو کتاب از خود بھیج دی جائے گی۔ فرمائشوں کی تعمیل فرمائشیں موصول ہونے کی ترتیب کے مطابق کی جائے گی۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام

۲۵/ بی ـــ گلبرگ ـــــ لاہور

طلوع اسلام کالج

(اپنے انداز کی منفرد تعلیم گاہ)

قوموں کا مستقبل ان کی ابھرنے والی نسلوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ جس قسم کے آج کے نوجوان، اسی قسم کی کل کی قوم۔ اگر نوجوانوں کی تعلیم و تربیت صحیح خطوط پر ہو جائے تو قوم خود بخود صحیح قالب میں ڈھل جائیگی۔ حصول پاکستان کے بعد سب سے مقدم کرنے کا کام یہ تھا کہ ہم اپنے بچوں کی تعلیم اس آئیڈیالوجی کے مطابق کرتے جس کے تحفظ کے لئے ہم نے پاکستان حاصل کیا تھا۔ ہم نے اس مقدس فریضہ سے مجرمانہ تغافل برتا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم آج اپنی قوم کی بے راہ روی کا اسقدر ماتم کر رہے ہیں۔ یہ قوم کونسی ہے جس کی ہم اس قدر شکایت کر رہے ہیں؟ یہ انہی نوجوانوں پر مشتمل ہے جو تشکیل پاکستان کے وقت ہماری درسگاہوں میں زیر تعلیم تھے۔ وہی طالب علم سولہ سترہ برس کے بعد اب ہماری قوم کا ہوشمند طبقہ بن گئے ہیں۔ اور انہی کا رونا ہم آئے دن روتے رہتے ہیں۔ لیکن ہماری حالت بھی عجیب ہے ہم قوم کی بے راہ روی کا رونا بھی روتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی ہر سال اس قوم میں اضافہ بھی کرتے چلے جاتے ہیں۔ جو نوجوان ہماری درسگاہوں سے غلط تعلیم حاصل کر کے باہر نکلتے ہیں وہ ہماری قوم کے اجزا بنتے ہیں۔ اس تباہی سے بچنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ ہم قوم کے نوجوانوں کی تعلیم کا صحیح انتظام کریں۔

۲۔ پاکستان کی آئیڈیالوجی قرآن کریم کی تعلیم اور نبی اکرمؐ کی سیرت طیبہ کے قرآنی تصور کے سوا اور کیا ہے۔ لہٰذا ہمارے نوجوانوں کی صحیح تعلیم کا مقصود بھی اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ان کے قلب و دماغ کو اسی سانچے میں ڈھالا جائے اور ان میں ایسی صلاحیت پیدا کر دی جائے کہ دنیا کا کوئی معاملہ سامنے آئے، وہ فیصلہ کر سکیں کہ اس باب میں قرآن ہمیں کیا راہ نمائی دیتا ہے۔ اس کا طریق یہ نہیں کہ دینی تعلیم کے لئے مکتب اور دارالعلوم الگ کھولے جائیں اور دنیاوی تعلیم کے لئے اسکول اور کالج الگ۔ دین اور دنیا کی یہ ثنویت یکسر اسلام کے خلاف ہے۔ نہ ہی اس کا یہ طریق ہے کہ سکولوں اور کالجوں میں ایک پیریڈ دینیات کا رکھ دیا جائے۔ یا ایم اے کے لئے اسلامیات کا الگ مضمون تجویز کر دیا جائے۔ ان طریقوں سے طالب علموں کی معلومات میں تو کچھ اضافہ ہو سکتا ہے لیکن ان سے وہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا جسے علامہ اقبالؒ نے نہایت جامع انداز میں یوں بیان کیا ہے کہ ؎

از کلیدِ دیں درِ دنیا کشود

اسلامی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ اسے حاصل کرنے کے بعد طالب العلم اس قابل ہو جائے کہ "دنیا کا ہر دروازہ دین کی چابی سے کھول سکے"۔ اس مقصد کے لئے تعلیم کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ طالب علم طبیعیات پڑھیں یا عمرانیات۔ تاریخ پڑھیں یا فلسفہ۔ وہ معاشیات کا مطالعہ کریں یا سیاسیات کا ــــ غرضیکہ وہ علم کے کسی شعبے سے متعلق کیوں نہ ہوں، انہیں یہ بتایا جائے کہ علم کا یہ شعبہ اُس پروگرام کی تکمیل کے لئے کس طرح ممد و معاون ہو سکتا ہے جسے قرآن نے انسانی زندگی کا مقصود و منتہا قرار دیا ہے، یہ پروگرام اس کے سوا کیا ہے کہ

فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں وحیٔ خداوندی کی روشنی میں نوعِ انسان کی منفعتِ عامہ کیلئے صرف کیا جائے۔

اسے بالفاظِ دیگر یوں کہا جا سکتا ہے کہ قوم کے نوجوان طالب علموں کے دل و دماغ میں اس حقیقت کو راسخ کر دیا جائے کہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو وحیٔ کی متعین کردہ مستقل اقدار کے تابع رکھنا ہی شرفِ انسانیت کا ضامن ہو سکتا ہے۔ اس سے ان کی سیرت میں وہ پختگی اور کردار میں وہ پاکیزگی پیدا ہو جائے گی جس کے فقدان کا ہم اِسوقت اس قدر رونا روتے ہیں۔

۴۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لئے درسگاہ کی ضرورت ہے۔ یہی وہ نتیجہ ہے جس پر اپنے زمانے میں، پاکستان کے معمارِ اول، سر سید علیہ الرحمۃ پہنچے تھے اور انہوں نے مدرسۃ العلوم، علی گڑھ کی بنیاد رکھی تھی جس کے نتائج بعد کی نسلوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لئے۔ اب ہمارے حالات کا تقاضا ہے کہ ایک جدید درسگاہ کی بنیاد رکھی جائے جس کا مقصد وہ ہو جسے اوپر بیان کیا گیا ہے۔ یہ مقصد تحریک طلوعِ اسلام کے ذریعے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے جو "دنیا کے ہر دروازے کو قرآن کی کلید سے کھولنے" کی دعوت کی علمبردار ہے۔ اس کے لئے تجویز یہ ہے کہ ایک کالج کھولا جائے جس میں عام تعلیم یونیورسٹی کے منظور شدہ قاعدہ کے مطابق ہو، تاکہ وہاں کا فارغ التحصیل طالب علم، زندگی کے کسی شعبے میں، دوسرے کالجوں کے طالب علموں سے پیچھے نہ رہ جائے اور اُس کے لئے مختلف میدان، دوسرے طالب علموں کی طرح کھلے ہوں۔ لیکن اس کالج میں یہ مضامین اس طرح پڑھائے جائیں کہ طلباء کو ساتھ کے ساتھ معلوم ہوتا جائے کہ ان میں کونسی بات قرآنی تعلیم کے خلاف ہے، اور قرآن کریم اس باب میں کیا نقطۂ نگاہ پیش کرتا ہے۔ علاوہ ازیں، انہیں قرآن کریم کی تعلیم اس طرح دی جائے کہ

(۱) پاکستان میں وقتاً فوقتاً جو مسائل سامنے آئیں، وہ بتا سکیں کہ اس باب میں قرآن کیا راہ نمائی دیتا ہے۔ اسلامی مملکت کا آئین کیسا ہونا چاہئے اور قوانین کس قسم کے۔ افراد کی زندگی، اسلامی قالب میں کس طرح ڈھل سکتی ہے اور معاشرہ، قرآنی خطوط پر کس طرح متشکل ہو سکتا ہے۔ وہ کونسی عملی کسوٹی ہے جس سے ہر وقت معلوم کیا جا سکے کہ قوم صحیح راستے پر چل رہی ہے، یا اس کا کوئی قدم غلط سمت کو اٹھ گیا ہے۔ اور

(۲) دنیا کی مختلف قومیں اسوقت جن معاشی۔ معاشرتی۔ سیاسی۔ قومی اور بین الاقوامی مسائل سے دوچار ہیں اور جن کا کوئی اطمینان بخش حل انہیں نہیں ملتا جس کی وجہ سے اہلِ عالم سخت خطرے میں پڑ رہا ہے، قرآن کریم

ان مسائل کا کیا حل تجویز کرتا ہے۔

اس کالج کے فارغ التحصیل طالب العلم ایسی قابلیت کے مالک ہوں کہ وہ دنیا کے بڑے بڑے اجتماعات میں، قرآنی نقطۂ نگاہ نہایت وضاحت سے پیش کر سکیں اور اپنے ملک میں بھی دوسروں کی راہ نمائی کر سکیں۔

ذہنی قابلیت کے علاوہ ان کا کیریکٹر بھی اتنا بلند ہونا چاہئے کہ وہ دوسرے نوجوانوں کے لئے قابل تقلید مثال پیش کر سکیں اور اس طرح اس حقیقت کی زندہ شہادت پیش کر سکیں کہ جب انسانی قلب و دماغ قرآن کے قالب میں ڈھل جائیں اور وہ سیرت نبی اکرمؐ کو اپنے سامنے بطور اسوۂ حسنہ کے رکھ لیں، تو اس سے کس طرح ایسے انسان پیدا ہوتے ہیں جن پر انسانیت فخر کر سکے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی تربیت کے لئے، کالج کے ساتھ ہوسٹل کا ہونا بھی ضروری ہے۔

یہ ہے وہ مقصد جس کے لئے ایک جدید طرز کی درسگاہ کے قیام کا پروگرام سامنے رکھا گیا ہے۔ سر دست تجویز یہ ہے کہ اس کی ابتدا ایف۔ اے (سال اول) سے کی جائے اور اسے سال بہ سال آگے بڑھاتے چلے جائیں۔ اس کے بعد، ابتدائی اسکولوں کی بنیاد رکھی جائے تاکہ شروع ہی سے بچوں کی تعلیم اسی نہج پر ہو۔ درسگاہیں لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے لئے قائم کی جائیں۔ اور جب یہ سلسلہ پھیل جائے تو اس کے لئے ایک الگ یونیورسٹی قائم کی جائے۔ انہی درسگاہوں میں اساتذہ تیار کئے جائیں۔ اس طرح یہ درسگاہیں ملک کے عام نظام تعلیم کے لئے نمونہ کا کام دے سکیں گی اور وہ نظام خود بخود اپنے آپ کو اس قالب میں ڈھال لیگا۔ اس سے پاکستان میں ایک نئی قوم تیار ہو جائے گی جو اس آئیڈیالوجی کی پیکر ہوگی جس کے لئے اس مملکت کو حاصل کیا گیا تھا۔

۴۔ اس مقصد کے لئے "قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی" کے نام سے ایک سوسائٹی متشکل کی گئی ہے جسے حکومت کے ہاں سے باقاعدہ رجسٹرڈ کرا لیا گیا ہے۔ اس کی ایک ایگزیکٹو کمیٹی بھی متعین کر لی گئی ہے سوسائٹی کا دفتر سردست ۲۵/بی۔ گلبرگ (۲) لاہور میں قائم کیا گیا ہے۔ سوسائٹی کے چیئرمین محترم پرویز صاحب ہیں جن کی قرآنی فکر کی روشنی میں اس کالج کا قیام عمل میں لایا جا رہا ہے۔ ان کی دیرینہ خواہش تھی کہ وہ اپنی عمر کے آخری حصہ میں قوم کے بچوں کو لے کر بیٹھ جائیں اور قرآنی شمع ان کے ہاتھ میں دے کر دنیا سے رخصت ہوں۔ ان کی اس آرزو کی برومندی بھی اسی اسکیم سے وابستہ ہے۔

(۵) یہ سوسائٹی عزم راسخ لے کر اٹھی ہے اور یہی سردست اس کی متاع ہے۔ ہمیں اس کا احساس ہے کہ یہ اسکیم اپنی تکمیل کے لئے بہت بڑے ذرائع اور وسائل چاہتی ہے جو اس وقت اسے میسر نہیں۔ لیکن اسے امید ہے کہ قوم کے وہ درد مند افراد جو ملت کے سچے بہی خواہ ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہماری آنے والی نسلیں تباہی سے بچ جائیں۔ ان کا وجود باعث فخر پاکستان اور وجہ شرف انسانیت ہو، وہ ہمارے اس عزم کو بروئے کار لانے کے لئے آگے بڑھیں گے اور ہر طرح سے ہم سے تعاون کریں گے۔

(۶) طلوع اسلام کنونشن ۱۹۶۴ء میں کالج فنڈ کے سلسلہ میں جو اپیل کی گئی تھی اس کے جواب میں جو رقوم راقم الحروف کو

اب تک موصول ہوئی ہیں ان کی رسیدیں معطیان کو بھیجدی گئی ہیں۔ اگر کسی صاحب کو اب تک رسید نہ ملی ہو تو وہ براہ کرم مجھے مطلع فرمائیں۔ ان رقوم کے علاوہ مجھے اور کوئی رقم موصول نہیں ہوئی۔

(۷) سوسائٹی کا حساب بینک میں کھول دیا گیا ہے اور جو روپیہ میری تحویل میں تھا اسے اس حساب کی طرف منتقل کر دیا گیا ہے۔ ان عطیات کی، اور جو اس کے بعد موصول ہونگے، ان کی پوری تفصیل طلوع اسلام کی سالانہ کنونشن میں پیش کر دی جائے گی۔

جن احباب نے اس فنڈ میں حصہ لینے کے وعدہ کئے تھے ان سے درخواست ہے کہ وہ اپنے وعدوں کا جلد ایفا کریں۔

(۸) جملہ عطیات ذیل کے پتہ پر بھیجے جائیں اور اس کی تصریح کر دی جائے کہ یہ کالج فنڈ کے سلسلہ میں ہیں۔

میرزا محمد خلیل صاحب۔
۲۵/بی۔ گلبرگ (۲) ۔ لاہور

چیک اس نام سے کاٹے جائیں اور کراس بھیجے جائیں

QURANIC EDUCATION SOCIETY (REGD.)

بینک ڈرافٹ

حبیب بنک۔ گلبرگ ۔ لاہور

کے نام لکھے جائیں۔

(۹) آخر میں اسے پھر دہراؤں کہ اگر یہ تعلیمی اسکیم عمل میں آگئی ــــ اور جب آپ ہمت کریں گے تو یہ عمل میں کیوں نہیں آئیگی ــــ تو اس سے ہماری قوم ایک نیا موڑ مڑ جائیگی۔ اس سے تاریخ کے دھارے کا رخ بدل جائیگا۔ اور اس میں حصہ لینے والے ــــ السابقون الاولون ــــ کا نام زمانے کے صفحات پر سورج کی کرنوں سے لکھا جائیگا جسطرح سرسیدؒ کا دارالعلوم حصول پاکستان پر منتج ہوا۔ کیا عجب کہ یہ نئی درسگاہ، پاکستان کو ایک صحیح قرآنی مملکت میں تبدیل کرنیکا موجب بن جائے۔ کتنی حسین ہے ہماری یہ آرزو۔ اور کیا درخشندہ ہے اسکا مستقبل ــــ واللہ المستعان۔ علیہ توکلت۔ والیہ انیب۔

والسلام

نیاز آگیں

(شیخ سراج الحق)

سکرٹری۔ قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی۔

۲۵/بی گلبرگ (۲)
لاہور

ہم عید الفطر کیوں منائیں؟

بتقریب جشن نزول قرآن

بتاریخ ۳۱ جنوری ۱۹۶۵ء

پرویز صاحب کا

بصیرت افروز خطاب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہم عید کیوں مناتے ہیں

[۲۱۔ جنوری ۱۹۶۵ء کی صبح ۲۵/بی گلبرگ میں ایک عام اجتماع ہوا جس میں مسلسل درس قرآن کریم کے بجائے پرویز صاحب کے خطاب کا موضوع تھا۔ ہم عید کیوں مناتے ہیں۔ یہ خطاب ساتھ کے ساتھ ٹیپ پر ریکارڈ ہوتا گیا۔ ازاں بعد اسے ٹیپ سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کر لیا گیا۔ اور اب موضوع کی اہمیت کے پیش نظر اسے بطور ہدیہ تبریک عید قارئین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے]۔

عزیزانِ من! سلام و رحمت۔

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، میرے آج کے خصوصی خطاب کا موضوع ہے۔ ہم عید کیوں مناتے ہیں ـــــ یہ موضوع بظاہر ایسا پیش پا افتادہ اور فرسودہ سا نظر آتا ہے کہ جب اس کا اعلان ہوا تو ایک صاحب سے نہ رہا گیا۔ وہ پوچھ ہی بیٹھے کہ اس موضوع کی اہمیت کیا ہے؟ کون نہیں جانتا کہ ہم عید کیوں مناتے ہیں؟۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر ایسا ہی ہے تو ذرا آپ ہی فرما دیجئے کہ ہم عید کیوں مناتے ہیں؟ انہوں نے جھٹ سے کہا کہ ہم عید اس لئے مناتے ہیں کہ ..... کہ ..... یہ عید ہے۔ اسے منانا چاہیئے! کچھ توقف کے بعد انہوں نے کہا کہ یہ رمضان المبارک کے وداع ہونے کی خوشی میں عید منائی جاتی ہے۔ میں نے کہا کہ آپ نے کبھی اس پر غور فرمایا ہے کہ جمعۃ الوداع کو مسجدوں میں رو رو کر کیا جاتا ہے۔ الوداع اے ماہِ رمضان الوداع۔ خطبوں میں اس کی جدائی پر بین کئے جاتے ہیں۔ نوحے پڑھے جاتے ہیں۔ پکار پکار کر کہا جاتا ہے کہ

تیری فرقت میں جلتے ہیں سینے ـــ کیسے گذریں گے "یاراں" مہینے

ستم ظریفی کی انتہا

رمضان المبارک کے وداع ہونے کے تصور سے ہم اسقدر اشک فشاں اور نوحہ کناں ہوتے ہیں، لیکن جب وہ وداع ہو جاتا ہے تو ہم اس خوشی میں عید مناتے ہیں! کبھی آپ نے سوچا بھی ہے کہ ہم

کیا کرتے ہیں ؟ اور اگر کبھی رمضان المبارک کو ہماری نوحہ خوانی پہ ترس آجاتا ہے اور وہ ازراہِ ہمدردی اور دلجوئی یہ کہہ دیتا ہے کہ اچھا' میرے دوستو! میں آپ کی خاطر ایک دن اور رک جاتا ہوں۔ میں ۲۹ کی بجائے ۳۰ کی شام کو چلا جاؤنگا۔ تو ہمارے ہاں صفِ ماتم بچھ جاتی ہے۔ عید کی آمد کی پرجوش تیاریوں پر اوس سی پڑ جاتی ہے۔ ہم دیدے پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہیں کہ کہیں سے عید کا چاند دکھائی دے۔ ہم ٹمبکٹو تک تاریں بھیجتے ہیں کہ رمضان المبارک کے وداع ہو جانے کی خوش خبری مل جائے۔ اور جب ہر طرف سے مایوسی ہو جاتی ہے تو صبر شکر کر کے بیٹھ جاتے ہیں اور اس کے بعد تیس کے چاند کی عید یوں مناتے ہیں جیسے کسی نے بیگار میں پکڑ رکھا ہو۔ کیا عزیزانِ من! کبھی آپ نے سوچا بھی کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اور ہم عید کیوں مناتے ہیں ؟

دنیا کی ہر قوم کوئی نہ کوئی تہوار مناتی ہے۔ ہم بھی سال کے مختلف دنوں میں بعض تیوہار مناتے ہیں۔ لیکن اس عید کا تیوہار

خدا کا مقرر کردہ تیوہار

وہ ہے جسے بطور جشنِ مسرت منانے کا حکم خود خدا نے دیا ہے۔ اس سے آپ اس تیوہار کی اہمیت کا اندازہ لگا لیجئے۔ سورۂ یونس میں ہے۔ یَآ اَیُّھَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْکُمْ مَّوْعِظَۃٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ۔ اے نوعِ انسان! تمہاری طرف تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے' ایک ضابطہ قوانین نازل ہوا ہے جو انسان کے تمام نفسیاتی امراض کا علاج اپنے اندر رکھتا ہے ۔ وَ ھُدًی وَّ رَحْمَۃٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ۔ اور ان لوگوں کے لئے جو اس کی صداقتوں پر یقین رکھیں سامانِ نشوونما اور منزلِ انسانیت تک پہنچنے کی راہ نمائی ہے۔ اس کے بعد فرمایا۔ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰہِ وَ بِرَحْمَتِہٖ ۔ اے رسول! ان سے کہہ دو کہ یہ خدا کے فضل و رحمت سے ہے کہ ایسا عدیم النظیر ضابطہ زندگی تمہیں مل گیا ہے۔ تم کیا' اگر ساری دنیا کے انسان مل کر بھی کوشش کرتے تو اس جیسا ضابطہ نہ مل سکتا۔ لہٰذا فَبِذٰلِکَ فَلْیَفْرَحُوْا ۔ تمہیں چاہیئے کہ ایسی متاعِ گراں بہا کے اس طرح بے مزد و معاوضہ مل جانے پر جشنِ مسرت مناؤ۔ وہ متاعِ گراں بہا کہ ھُوَ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ (۱۰/۵۸) انسان جو کچھ بھی جمع کرے۔ یہ اس سے کہیں زیادہ قیمتی ہے ۔ متاعِ کائنات سے زیادہ گراں بہا۔ سامانِ زیست سے زیادہ بیش قیمت!

یہ ہے برادرانِ عزیز! وہ تقریب سعید! جسے بطور جشنِ بہجت و مسرت منانے کی تاکید خدا نے کی ہے۔ یعنی جشنِ نزولِ قرآن۔ اور نزولِ قرآن کی ابتدا چونکہ رمضان کے مہینے میں ہوئی تھی (شَھْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْہِ الْقُرْاٰنُ (۲/۱۸۵) ۔ اس لئے رمضان کا پورا مہینہ گویا اس جشن کی تیاریوں کے لئے تھا۔ رمضان کی حقیقت و اہمیت کیا ہے اسے میں نے اپنی اس تقریر میں وضاحت سے بتایا تھا جو میں نے یومِ بدر کی تقریب پر (۱۷ جنوری کو) - وائی - ایم - سی - اے - ہال میں کی تھی۔ اسے دہرانے کا موقعہ نہیں۔ بہرحال' عید' درحقیقت نزولِ قرآن کی تقریب پر جشنِ مسرت منانے کا نام ہے۔

قرآن نے ہمیں کیا دیا ہے؟

یہاں، عزیزانِ من! ایک اور اہم سوال سامنے آتا ہے جس کا سمجھ لینا ضروری ہے وہ سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بالآخر ہمیں دیا کیا ہے جس کے لئے ہم سے جشنِ مسرت منانے کی تاکید کی گئی ہے۔ مذہب کی دنیا سے اس سوال کا جواب عجیب ملتا ہے۔ (میں برادرانِ عزیز! مذہب کی دنیا کہہ رہا ہوں۔ اسلام کی دنیا نہیں۔ قرآن کی دنیا نہیں۔ دین کی دنیا نہیں۔ انسانوں کے خود ساختہ مذہب کی دنیا جس میں قرآن کو عجیب و غریب معانی پہنا دیئے گئے ہیں)۔ اربابِ مذہب سے پوچھئے کہ انسان کی پیدائش کا مقصد کیا ہے۔ تو وہ اس کے جواب میں جھٹ سے کہہ دیں گے کہ اس کا مقصد خود خالقِ کائنات نے بتا دیا ہے جب کہا کہ

مذہب کی دنیا کا جواب

وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ (۵۶/۵۱) خدا نے جن و انس کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ اُس کی عبادت کریں۔ (میں اس آیۂ جلیلہ کا صحیح مفہوم ذرا آگے چل کر عرض کروں گا)۔ اب برادران! معاف فرمائیگا۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اول تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس دنیا میں ہم سے پوچھے بغیر بھیجدیا۔ اور پھر کہا کہ ہم نے تمہیں اس لئے بھیجا ہے کہ تم ہماری عبادت کرو — نمازیں پڑھو۔ روزے رکھو۔ حج کرو۔ زکوٰۃ دو۔ مشقتیں اٹھاؤ۔ تکلیفیں برداشت کرو۔ یہ کرو۔ وہ نہ کرو۔ ساری عمر جانکاہ پابندیوں میں بسر کرو۔ کیوں ایسا کرو؟ اس لئے کہ ہم تمہارے آقا ہیں۔ اور تم ہمارے غلام ہو۔ آقا، غلام کو جو حکم دے، اسے اس کی تعمیل کرنی ہوگی۔ اگر ایسا نہ کروگے تو تمہیں جہنم میں بھیجدیا جائیگا — یہ ٹھیک ہے۔ غلام کو اپنے آقا کا ہر حکم ماننا ہوگا۔ بالخصوص جب اس کی خلاف ورزی کی پاداش میں سامنے جہنم کا عذاب موجود ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس پر وہ غلام جشنِ مسرت منائیگا؟ خوشیوں کے شادیانے بجائے گا؟

یہ جواب وہ ہے جو ہمیں مذہب کی دنیا سے ملتا ہے۔ لیکن آیئے ہم دیکھیں کہ قرآن کریم کی بارگاہ سے ہمیں اس کا جواب کیا ملتا ہے، کہ وہی جواب درحقیقت خدا کا جواب ہوگا۔ قرآن کریم خدا اور انسان کے تعلقات کا تصور کچھ اور دیتا ہے۔ وہ انسان کی تخلیق کا مقصد کچھ اور بتاتا ہے اور ان پابندیوں کا مقصود کچھ اور۔ قرآن، خدا کی کتاب ہے۔

قرآن کا جواب

اس میں کسے کلام ہو سکتا ہے۔ لیکن وہ کہتا ہے کہ کتاب تو یہ خدا کی ہے مگر اس میں ذکر خود تمہارا ہے۔ لَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْکُمْ کِتٰبًا فِیْہِ ذِکْرُکُمْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۱۰/۲۱)۔ یہ حقیقت ہے کہ ہم نے تمہاری طرف ایک کتاب بھیجی ہے جس میں تمہارا ذکر ہے۔ کیا تم اس بلند حقیقت پر غور نہیں کرتے؟ عربی زبان میں لفظ ذکر کے ایک معنی تو وہی ہیں جو معنی ہم (اس لفظ کے) اردو زبان میں لیتے ہیں۔ انہی معانی کے پیشِ نظر علامہ اقبالؒ نے اس حقیقت کو اس حسین انداز میں بیان کیا تھا کہ

> محمدؐ بھی تیرا، جبریلؑ بھی، قرآن بھی تیرا — مگر یہ حرفِ شیریں، ترجماں تیرا ہے یا میرا؟

انسانی عظمت کا صحیفہ

قرآن، درحقیقت انسان کا ترجمان ہے۔ یہ ہے ذکر کا پہلا مفہوم۔ لیکن اس لفظ کا دوسرا مفہوم ہے۔ شرف و عظمت۔ عزت و توقیر۔ اس مفہوم کے اعتبار سے اس آیت کے معنی یہ ہوئے کہ

اس کتاب میں خود تمہارے شرف و عظمت کا راز پوشیدہ ہے۔ یہ تمہیں عزت و توقیر اور احترام و تکریم کا مقام عطا کرنے کے لئے بھیجی گئی ہے۔ اسی لئے دوسرے مقام پر کہا کہ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ (۲۳/۷۱)۔ ہم انہیں شرف و مجد کا مقام عطا کرتے ہیں اور ان کی حماقت دیکھو کہ یہ خود اپنے ہی شرف و احترام سے اعراض برتتے ہیں۔ اس سے روگردانی کرتے ہیں۔ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (۳۳/۷۲)۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ہی ظالم اور جاہل واقع ہوا ہے۔ بربنائے جہالت خود اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے۔

قرآن کریم یہ بتاتا ہے کہ انسان کو الوہیاتی توانائی کا ایک شمہ دیا گیا ہے جسے انسانی ذات (HUMAN - PERSONALITY) کہا جاتا ہے۔ اس میں اسقدر وسیع ممکنات کی دنیا مضمر ہے کہ اس سے انسان زندگی کے بلند سے بلند ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہوگیا ہے۔ لیکن انسانی ذات کی یہ صلاحیتیں غیر نشوونما یافتہ شکل میں دی گئی ہیں اور اس دنیا کی زندگی اس کی نشوونما کا میدان ہے۔ اقبال کے الفاظ ہیں۔

مقامِ پرورشِ آہ و نالہ ہے یہ چمن — نہ سیرِ گل کے لئے ہے نہ آشیاں کے لئے

یہ پابندیاں کیوں ہیں

انسان کے لئے جسقدر پابندیاں تجویز کی گئی ہیں وہ اس کی ذات کی نشوونما اور ثبات استحکام کا ذریعہ ہیں۔ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (۲/۲۸۶)۔ خدا نے انسان پر جسقدر پابندیاں عائد کی ہیں وہ اس کی ذات میں وسعت پیدا کرنے کے لئے ہیں۔ ان سے خدا کوئی اپنا مقصد حاصل نہیں کرنا چاہتا۔ واللہ غنی عن العالمین۔ خدا تمام کائنات سے مستغنی ہے۔ اسے اپنے پروگرام کی تکمیل کے لئے کسی سے کچھ کام لینے کی ضرورت نہیں۔ یہ سب انسان کے فائدے کے لئے ہے۔ قرآن کا ضابطہ خود انسان کے شرف و مجد کے جوہروں کی نمود اور اس کی صلاحیتوں کو جلا دینے کے لئے ہے۔ لہٰذا خدا اور انسان کا تعلق (معاذ اللہ) ایک مستبد آقا اور بیگار میں پکڑے ہوئے غلام کا نہیں۔ یہ ایک مشفق معلم اور طالب علم کا تعلق ہے جس میں استاد کی ہدایات، محنت کی تاکید اور بعض اوقات سرزنش سطح بین نگاہوں کو سختی نظر آتی ہے لیکن درحقیقت وہ متعلم کی صلاحیتوں کی نمود و پرورش کے پروگرام کی کڑیاں ہوتی ہیں۔

لہٰذا برادرانِ عزیز! اگر ہم دو لفظوں میں سمجھنا چاہیں کہ قرآن کریم نے انسان کو کیا دیا ہے۔ اسکی تعلیم کا ماحصل کیا ہے۔ اس کا مقصود و منتہیٰ کیا ہے۔ تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ

یہ انسان کو اس کے صحیح مقام سے آگاہ کرتا ہے

اس کے لئے اس نے کہا ہے کہ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (۱۴/۱) اے رسول! ہم نے یہ کتاب تیری طرف اس لئے نازل کی ہے کہ تو اس شمع نورانی کے ذریعے نوعِ انسان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آئے۔ ذرا سوچئے کہ تاریکی میں کیا ہوتا ہے اور روشنی اس کی جگہ کیا کرتی ہے۔ تاریکی میں کسی شے کا صحیح مقام متعین نہیں ہوتا۔ روشنی میں ہر شے اپنی صحیح صحیح حقیقت کے ساتھ اپنے مقام پر نظر آجاتی ہے۔ یہ تاریکی ہی ہے جس میں ہم رسّی کو

سانپ (اور سانپ کو بعض اوقات رسّی) سمجھ لیتے ہیں۔ روشنی آجانے سے رسّی، رسّی اور سانپ سانپ کی شکل میں سامنے آجاتا ہے۔ نزولِ قرآن سے پہلے انسان پر اسقدر تاریکیاں چھائی ہوئی تھیں کہ نہ وہ خارجی کائنات کی کسی شے کو اس کی اصلی شکل میں دیکھ سکتا تھا، نہ وہ اپنے مقام سے آگاہ تھا ــــ یہ تاریکیاں کیا تھیں؟ قلب اور دماغ کی تاریکیاں۔ فکر و نظر کی

تاریکیوں میں گھرا ہوا انسان

تاریکیاں۔ یعنی جہالت اور توہم پرستی کی تاریکیاں۔ استبداد اور غلوِ عقیدت کی تاریکیاں۔ مختصراً یہ کہ اپنے مقام سے بیگانگی کی تاریکیاں ــــ اور حقیقت یہ ہے کہ تمام تاریکیوں کا سرچشمہ اور منبع یہی تاریکی تھی۔ باقی سب تاریکیاں اسی کی پیداوار تھیں۔ اگر انسان پر اس کا صحیح مقام روشن ہو جائے تو یہ تمام تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں ــــ لہٰذا سوال یہ ہے کہ قرآن کریم نے انسان کا صحیح مقام کیا بتایا ہے؟ اگر ہم اس سوال کے جواب کی تفصیل میں جانا چاہیں تو اس کے لئے سارے کا سارا قرآن سامنے لانا پڑیگا۔ اس کے لئے بڑا وقت چاہیئے۔ لہٰذا میں اس تھوڑے سے وقت میں اس سوال کے صرف چند ایک گوشے آپ کے سامنے لاؤنگا۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

قرآن سے پہلے انسان کی حالت

لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی جب تک پہلے یہ نہ دیکھ لیا جائے کہ نزولِ قرآن سے پہلے انسان کن تاریکیوں میں ڈوبا ہوا اور کن پستیوں میں گرا ہوا تھا۔ اس حقیقت کو علامہ اقبالؒ نے مثنوی اسرار و رموز کے چند اشعار میں نہایت حسن و ایجاز سے بے نقاب کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

بود انساں در جہاں انساں پرست ـــ ناکس و نابود مند و زیر دست
سطوتِ کسریٰ و قیصر رہزنش ـــ بندہا در دست و پا و گردنش
کاہن و پاپا و سلطان و امیر ـــ بہرِ یک نخچیر صد نخچیر گیر!
صاحبِ اورنگ و ہم پیرِ کنشت ـــ باجے از کشتِ خراب او نوشت
در کلیسا اسقف رضواں فروش ـــ بہر ایں صیدِ زبوں دامے بدوش
برہمن گُل از خیابانش ببرد ـــ خرمنش مغ زادہ با آتش سپرد

از غلامی فطرتِ او دوں شدہ
نغمہ ہا اندر نئے او خوں شدہ

یہ تھی انسان کی کیفیت نزولِ قرآن کے وقت ــــ انسان، انسان کی پرستش کرتا تھا۔ ان کی غلامی کا جوا اس کی گردن میں پڑا تھا۔ کہیں ملوکیت کا آہنی پنجہ اس کی رگِ جان کو دبائے ہوئے تھا۔ کہیں "روحانیت" کی غیر مرئی زنجیریں اس کے قلب و دماغ کو بُری طرح جکڑے ہوئے تھیں۔ کہیں سرمایہ پرست کی ہوسِ خون آشامی اس کے لہو کا آخری قطرہ تک چوس رہی تھی۔ غرضیکہ ہزار شکاری تھے اور یہ ان میں گھرا ہوا، مظلوم و مقہور، بیکس و بےبس نخچیر ــــ یہ تھی انسان کی کیفیت جب قرآن آیا۔

قرآن آیا اور اس نے آکر اعلان کیا کہ خدا کے اس عظیم داعیِ انقلابؐ کے ظہورِ قدسی کا مقصد یہ ہے کہ

زنجیر شکن انقلاب

وَ يَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۷/۱۵۷)

یہ ان زنجیروں کو توڑ دے گا جن میں انسان جکڑا ہوا چلا آرہا ہے یہ اس کے سر سے ان بوجھل سلوں کو اتار پھینکے گا جن کے بوجھ سے یہ کچلا جا رہا ہے۔ ان زنجیروں میں سب سے پہلی زنجیر اس کی توہم پرستی کی تھی جس کی رُو سے یہ خارجی کائنات کی ہر قوت سے ڈرتا تھا۔ بادل گرجا اور یہ سہم گیا۔ بجلی کڑکی اور یہ دبک کر بیٹھ گیا۔ بارش شروع ہوئی تو یہ کپکپا اٹھا۔ پہاڑ سامنے آیا تو اس کی ہیبت سے لرز اٹھا۔ دریا میں موجیں اٹھیں تو اس کا کلیجہ اچھلنے لگا۔ ان مہیب قوتوں کے خطرات سے بچنے کے لئے اس کے ذہن میں ایک ہی طریق آسکتا تھا۔ اور وہ یہ کہ ان قوتوں کو خدا تسلیم کر لیا جائے۔ ان کے سامنے جھکا جائے ڈنڈوت بجا لایا جائے۔ ان کی پرستش کی جائے۔ ان کے حضور قربانیاں دے کر انہیں خوش کرنے کی کوشش کی جائے۔ خارجی قوتوں (مظاہر فطرت) کے مقابلہ میں یہ تھا وہ مقام جو انسان نے اپنے لئے تجویز کر رکھا تھا۔ قرآن آیا اور اس نے اسے للکار کر کہا کہ تو ان سے ڈرتا ہے؟ حالانکہ کیفیت یہ ہے کہ

تسخیر فطرت

وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ۚ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ۔ (۴۵/۱۳)

کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے اسے خدا نے تمہارے فائدے کے لئے قوانین کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے اگر تم ذرا غور و فکر سے کام لو تو یہ حقیقت واشگاف ہو جائے کہ ان کا مقام کیا ہے اور تمہارا مقام کیا۔ یہ سب خادم ہیں اور انسان ان کا مخدوم۔ یہ سب ساجد ہیں اور انسان ان کا مسجود۔ یہ سب قوانین خداوندی کے تابع مجبور زندگی بسر کر رہی ہیں اور انسان کو ان قوانین کا علم دے دیا گیا ہے۔ وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (۲/۳۱) جوں جوں تم ان قوانین کا علم حاصل کرتے جاؤ گے، یہ قوتیں تمہارے سامنے جھکتی جائیں گی۔ یہی وہ حقیقت جس کے پیش نظر روحِ ارضی نے اقبالؒ کے الفاظ میں، آدم کا یہ کہہ کر استقبال کیا تھا کہ

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں ۔ یہ گنبدِ افلاک یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ، یہ صحرا، یہ سمندر، یہ ہوائیں تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

یہ تھا وہ انقلاب آفریں پیغام جو قرآن نے انسان کو دیا اور اسے بتایا کہ

تو مردِ میداں تو میر لشکر ۔ نوری حضوری تیرے سپاہی

کائنات اور اس کی تمام قوتیں۔ ارض و سما اور ان کی سب نیرنگیاں ۔ (لَكُمْ) تمہارے لئے ہیں۔ تم ان کے لئے نہیں ہو۔

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے
جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے

ہر بات قانون کے مطابق

اور پھر یہ بھی سمجھ لو کہ یہ قوانین جن کے مطابق یہ عظیم و مہیب قوتیں مصروفِ عمل ہیں، اٹل ہیں۔ غیر متبدل ہیں۔ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا۔ اس لئے تمہیں اس کا خدشہ نہیں ہونا چاہیئے کہ نہ معلوم کسی وقت یہ قانون بدل جائے اور یہ قوتیں میرے قابو سے نکل جائیں۔ یہاں ہر بات قانون کے مطابق ہوتی ہے۔ قانون کے مطابق ہوتی رہے گی۔ اور ان قوانین میں کبھی تبدیلی نہیں آئے گی۔ یہ جو آج برادرانِ عزیز! زمین کو چھوڑ کر، چاند پر کمندیں ڈالی جا رہی ہیں اور مریخ کو زیر پا لانے کے منصوبے بن رہے ہیں تو یہ کچھ اسی یقینی حکم کے تابع ہو رہا ہے جسے قرآن نے آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے انسان کو یہ کہہ کر دلایا تھا کہ ان قوانین میں کبھی تبدیلی نہیں ہوگی لہٰذا تم نہایت اطمینان اور کامل اعتماد کے ساتھ ان مظاہرِ فطرت کو مسخر کرتے جاؤ۔

قرآن کا آئینہ

یہ تھا وہ آئینہ جس میں قرآن نے، انسان کو اس کی حقیقی شکل دکھائی۔ اس حقیقت کو علامہ اقبال نے اپنے مخصوص تمثیلی انداز میں، مثنوی اسرار و رموز کی ایک حکایت میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک شیر کا بچہ، پیدا ہونے کے ساتھ ہی، کسی حادثے کی وجہ سے، ماں باپ سے الگ ہو کر، جنگل میں بھیڑوں کے گلے میں مل گیا۔ وہ وہیں بڑھا پھولا، شکل تو اس کی شیر کی سی رہی لیکن عادات و خصائل سب بھیڑوں کی پیدا ہو گئیں۔ ایک دن، ایک شیر نے بھیڑوں کے اس گلے پر حملہ کیا، تو وہ کیا دیکھتا ہے کہ جہاں اس کی دہشت سے بھیڑیں بدحواس بھاگی جا رہی ہیں، ان میں ایک شیر بھی اسی طرح، ڈرے، سہمے، جھاڑیوں کے نیچے چھپنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ حیران تھا کہ یہ ماجرا کیا ہے؟ شیر،

بھیڑوں میں پلا ہوا شیر

اور بھیڑوں کی طرح بزدل! تھوڑے سے توقف کے بعد بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے بھیڑوں کا خیال چھوڑ دیا اور سیدھا اس میش نما شیر کی طرف لپک کر آیا۔ اسے جھاڑی میں جا دبوچا اور کان سے پکڑ کر اپنے ساتھ، ایک ایسے شفاف چشمے کے کنارے لے آیا جس میں ان کا عکس صاف دکھائی دے۔ اس نے اس شیر کو اپنے برابر کھڑا کیا اور اس کا سر جھکا کر چشمے میں اسے اس کا عکس دکھایا۔ شیر نے جب اپنا عکس دیکھا تو اپنے مقام سے آگاہ ہو گیا۔ اور ایک ہی ثانیہ میں بھیڑ سے شیر بن گیا۔

قرآن نے اپنے آئینے میں، انسان کو اس کا صحیح عکس دکھایا تو وہ ایک ہی جست میں، مسجودِ ملائک اور مخدومِ کائنات بن گیا۔

کہئے برادرانِ عزیز! کیا یہ عظیم واقعہ ایسا تھا یا نہیں کہ انسان اس پر جشنِ مسرت منائے؟

اب آگے بڑھیئے۔ انسان کے لئے، مجبورِ محض اشیائے کائنات کو مسخر کر لینا پھر بھی آسان تھا۔ مشکل مرحلہ وہ تھا جہاں، انسان دوسرے انسان کے استبداد کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ یہ زنجیر، انسانی

کسی کی محکومی نہیں

حکمرانی کی تھی۔ اور اس خوئے غلامی میں اسے اسقدر پختہ کر دیا گیا تھا کہ وہ انسانوں کی محکومیت

کو اپنی فطرت کا تقاضا اور اُن کا پیدائشی حق سمجھنے لگ گیا تھا۔ قرآن آیا اور اس نے یہ انقلاب آفریں اعلان کیا کہ

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ
لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ
بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (۳/۷۸)

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں ـــ خواہ خدا نے اسے ضابطۂ کتاب۔ حکومت۔ حتکہ نبوت بھی کیوں نہ دی ہو۔ کہ وہ دوسرے انسانوں سے کہے کہ تم خدا سے ورے، میری محکومی اختیار کرو۔ اسے یہی کہنا چاہئے کہ تمہیں ربانی بننا چاہئے۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم اس کتابِ خداوندی کی اطاعت کرو جسے تم پڑھتے پڑھاتے رہتے ہو۔

آپ نے دیکھا! برادرانِ عزیز! کہ قرآن کریم کے اس ایک اعلان نے کس طرح، ہر قسم کی انسانی حکمرانی کی زنجیروں کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے رکھ دیا۔ اس نے انسان کو ہر قسم کی انسانی غلامی سے نجات دلا کر اسے ایک خدا کی محکومیت کی دعوت دی۔ اور وہ محکومیت بھی، قانون کی، جو خدا کی کتاب میں دیا گیا ہے اور جس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ قرآن کی ساری تعلیم اسی بنیادی نقطہ کی شرح ہے کہ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ (۷/۳)۔ اطاعت صرف قوانینِ خداوندی کی کرو۔ ان کے علاوہ کسی انسان کی اطاعت مت کرو۔ اور یہی ہے وہ عظیم حقیقت جسے قرآن کریم کی اس آیت میں دھرایا گیا ہے جسے میں نے سب سے پہلے پیش کیا تھا۔ یعنی وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (۵۱/۵۶) انسان کا تخلیقی مقصد یہ ہے کہ وہ صرف قوانینِ خداوندی کی محکومیت اختیار کرے۔ اگر اس نے اس کے علاوہ کسی اور کی محکومی اختیار کر لی تو یہ اس کی تخلیق کے مقصد کے خلاف ہو گا۔ آپ نے غور کیا برادران! کہ قرآن نے اس ایک اعلان سے کہ

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے ـــ حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

انسان کو کس طرح اس ذلت و پستی سے نکال کر، جو اُسے اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کے سامنے جھکنے سے ننگِ انسانیت بنا دیتی تھی، شرفِ آدمیت کے بلند ترین مقام پر لا کھڑا کیا ـــ ایک خدا کی اطاعت، اور وہ بھی قانون کی رو سے، اس کے لئے کس طرح دنیا بھر کی سرفرازیوں کا موجب بن گئی۔ اور اسے یہ حقیقت سمجھا گئی کہ

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے ـ ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

مذہبی پیشوائیت کی محکومی

یہ تو تھا ملوکیت کا استبداد جو ایک انسان کو دوسرے انسان کے سامنے جھکنے پر مجبور کرتا ہے۔ لیکن یہ جھکنا انسان کے بدن کا تھا۔ وہ چاہتا تو اپنے قلب و دماغ کو اس سے آزاد رکھ سکتا تھا۔ لیکن اس سے آگے انسان کے جھکنے کا وہ مقام آتا ہے جس میں اس کا قلب و دماغ محکومیت، اور بڑی شدید محکومیت کی زنجیروں میں جکڑا جاتا تھا۔ یہ محکومیت تھی مذہبی پیشوائیت کی، جو دوسرے انسانوں سے اپنی خدائی منواتی تھی، خواہ یہ

"رضوانِ فروش" شریعت کے علمبرداروں کی طرف سے ہو اور خواہ "جنت بداماں" طریقت کے مدعیوں کی طرف سے۔ قرآن نے غلط عقیدت مندی کے عنکبوتی جالوں میں جکڑے ہوئے انسان کو آواز دی' اور اس سے کہا کہ آ! میں تمہیں بتاؤں کہ یہ جو مقدس نقابوں کی اوٹ میں' خدا کے نمائندے بن کر تمہارے سامنے آتے ہیں' ان کی حقیقت کیا ہے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ (۹/۳۴)۔ پیرانِ طریقت ہوں یا علمائے شریعت۔ ان میں سے اکثر کا یہ عالم ہے کہ خود کچھ نہیں کماتے اور دوسروں کی کمائی پر عیش کرتے ہیں۔ دعوے ان کا یہ ہے کہ یہ لوگوں کو خدا کی راہ بتاتے ہیں لیکن درحقیقت انہیں خدا کے راستے سے روکتے ہیں۔ ان کا وجود اس راستے میں سنگِ گراں بن کر حائل ہوتا ہے۔ یہ خدا سے ورے' خود خدا بن کر بیٹھے ہیں' (أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ) اس لئے خدا تک تمہیں پہنچنے ہی نہیں دیتے۔ راستے ہی میں تمہیں روک لیتے ہیں۔ یہ رہبر نہیں' رہزن ہیں یہ اس لئے کہ اگر لوگ "خدا تک پہنچ جائیں" (یعنی اس کی کتاب کو اپنا راہ نما بنا لیں) تو ان "خدا کے نمائندوں" کا وجود ہی ختم ہو جائے۔ ان کی خدائی کی حقیقت تو اتنی ہے کہ

این خدا تا سجدہ اش کردی خدا ست — چون بگے اندر قیام آئی فنا ست

مذہبی پیشوائیت کی حکمرانی کا دائرہ زندہ انسانوں تک ہی محدود نہیں ہوتا۔ ان کی حکومت ان کے مرنے کے بعد بھی قائم رہتی ہے — بلکہ مرنے کے بعد ان کی گرفت اور زیادہ مضبوط ہو جاتی ہے۔ "روحانیت" کی دنیا میں' زندہ انسانوں پر مردے حکومت کرتے ہیں۔

زندہ بدستِ مردہ

یہاں مردہ بدستِ زندہ نہیں ہوتا۔ زندہ بدستِ مردہ ہوتا ہے۔ زندہ انسان' ان مردوں کی بے پناہ قوتوں کے خیال سے کانپتا ہے۔ ڈرتا ہے۔ ان کے حضور منتیں مانتا اور نذرانے گذارتا ہے۔ اگر اس کے دل کی گہرائیوں میں بھی کوئی ایسا خیال گذر جائے جسے ذیرِ زمین "حضرت صاحب" کی شانِ اقدس میں گستاخی پر محمول کیا جا سکے' تو اس پر دن کا چین اور راتوں کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔ اور جب تک ان سے معافی مانگ کر انہیں راضی نہیں کر لیتا (اور یہ معافی' ان کے مجاوروں کے حضور' نذرانے گذارے بغیر مل نہیں سکتی) اس وقت تک وہ اطمینان کا سانس نہیں لیتا۔ یہ گذرے ہوئے احبار و رھبان' بزرگوں کی مزاروں کی شکلوں میں بھی زندہ و پائندہ ہوتے ہیں' اور ائمہ سلف کے اقوال و افعال کی صورت میں بھی ہر وقت اعصاب پر سوار۔ ان دونوں کی غلامی کا قلادہ' زندہ انسانوں کی گردن میں پڑا رہتا ہے (اس سے "تقلید" کے معنی آپ کی سمجھ میں آ جائیں گے۔ قلادہ اُس پٹے یا رسّے کو کہتے ہیں جو جانور کے گلے میں ڈال دیا جاتا ہے تاکہ اُس کا مالک جدھر جی چاہے اُسے' اس سے پکڑ کر کھینچتا پھرے اور وہ خاموش گردن جھکائے اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہے) ان کی "ہمہ وقت موجودگی" کا یہ عالم ہے کہ خدا کی کتاب کا ارشاد کچھ ہو' آپ کی عقل و بصیرت کچھ کہے' جونہی آپ نے اپنی عقل و فکر اور علم و بصیرت کی رُو سے کچھ کہا' ان میں سے کوئی نہ کوئی مردہ آپ کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا — اب آپ آگے بڑھ ہی نہیں سکتے —

یہ تھی برادرانِ عزیز! غلامی کی وہ شدید ترین اور بدترین شکل جس میں انسانیت جکڑی ہوئی چلی آرہی تھی۔ قرآن کریم نے ایک انقلابی آواز سے، غلامی کی ان زنجیروں کو تارِ عنکبوت کی طرح جھٹک کر الگ کر دیا۔ اس نے کہا کہ ان گذرے ہوئے اسلاف کی پوزیشن اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے اپنے وقت پر دنیا سے چلے گئے ۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ ۔ جو کچھ انہوں نے کیا اس کی ذمہ داری ان پر ہے اور وہی اپنے اعمال کے نتائج بھگتیں گے۔ جو کچھ تم کرو گے اس کی ذمہ داری تم پر عائد ہوگی۔ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۲/۱۳۴) تم سے یہ پوچھا ہی نہیں جائے گا کہ انہوں نے کس قسم کے کام کئے تھے۔ ان میں سے جو لوگ صاحب ایمان تھے، ان کے متعلق بھی زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہو کہ إِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ (۵۹/۱۰)۔ وہ ہمارے بھائی تھے جو ایمان کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ نہ ان کا کوئی قول تمہارے لئے سند ہو سکتا ہے۔ نہ ان کا کوئی عمل تمہارے لئے حجت۔ سند اور حجت خدا کی کتاب ہے، اور بس۔ اسلاف پرستی سے انسان کا ماضی تو روشن ہوتا ہے، لیکن مستقبل تاریک۔ اس نقطہ کی وضاحت کے لئے قرآن نے کہا ہے کہ اہل جہنم کی آنکھیں، پیشانی کے بجائے

گدی میں آنکھیں

ان کی گدی میں لگی ہوتی ہیں۔ (يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ۔ اس کی وجہ یہ کہ (خود ان کے الفاظ میں) وَقَالُوا رَبَّنَا إِنَّا أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَأَضَلُّونَا السَّبِيلَا (۳۳/۶۷) "ہم نے اپنے بڑے بزرگوں کی اطاعت کی۔ اور انہوں نے ہمیں غلط راستے پر ڈال دیا"۔ انہی کے متعلق قرآن دوسری جگہ (سورۂ یٰسین میں) کہتا ہے کہ ان کی گردنوں میں اس قسم کے طوق پڑ جاتے ہیں جن سے وہ راستہ دیکھنے کے قابل نہیں رہتے۔ ان کی نگہِ بصیرت سلب ہو جاتی ہے۔ ان کے آگے اور پیچھے اندھی عقیدت اور توہم پرستی کی دیواریں کھڑی ہو جاتی ہیں جن کی وجہ سے انہیں کچھ نظر ہی نہیں آتا (۳۶/۸)۔ سورۂ بقرہ میں قرآن نے مقلدین کو بھیڑوں کے گلے اور ان کے مقتداؤں کو گڈریے سے تشبیہ دی ہے۔ اور کہا ہے کہ گڈریا کچھ آوازیں نکالتا ہے، بے الفاظ۔ اور کچھ الفاظ بولتا

بھیڑوں کا گلہ

ہے، بے معنی۔ اور یہ بھیڑیں ان آوازوں پر اس طرح لگی ہوتی ہیں کہ یہ سر جھکائے، ان کے مطابق اِدھر اُدھر چلتی رہتی ہیں۔ نہ گڈریے کو معلوم ہوتا ہے کہ ان آوازوں کا کیا مطلب اور ان الفاظ کا کیا مفہوم ہے۔ اور نہ ہی ان بھیڑوں کو اس سے کچھ واسطہ۔ گڈریے سنے یہ آوازیں اور الفاظ اپنے بڑوں سے اسی طرح سن کر یاد کر رکھے ہوتے ہیں۔ اور بھیڑیں ان کے مطابق، اپنی عادتِ مستمرہ کے زور پر، غیر شعوری طور پر، ان کا اتباع کئے چلی جاتی ہیں۔ (۲/۱۷۱)

(جس طرح، معاف فرمایئے، ہم رمضان شریف میں قرآن شریف سنتے ہیں — نہ حافظ صاحب کو معلوم ہوتا ہے کہ جو الفاظ وہ منہ سے نکالتے ہیں ان کا مطلب کیا ہے۔ نہ سننے والوں کو علم ہوتا ہے کہ جو الفاظ وہ سنتے ہیں ان کا مفہوم کیا ہے، قرآن کریم اس لئے آیا تھا کہ اسے سمجھ کر اس پر عمل کیا جائے۔ بلا سمجھے اس کے الفاظ دھراتے رہنے سے اس کا مقصد کیسے پورا ہو سکتا ہے)۔

اس قسم کی ذہنی غلامی سے انسان کی کیفیت کیا ہو جاتی ہے، اس کا اندازہ لگانا ہو تو کسی صبح، جناح باغ میں جایئے،

قفس کا پرندہ

آپ دیکھیں گے کہ ایک تیتر والا خالی پنجرہ لئے آگے آگے جا رہا ہے' اور تیتر اس کے پیچھے پیچھے بھاگتا چلا آ رہا ہے۔ آزاد پرندے اُسے آوازیں دیتے ہیں کہ تمہارا مقام اِس طرف ہے۔ اُدھر کہاں جا رہے ہو۔ وہ ان آوازوں کو سنتا ہے ـــ اور بال و پر رکھنے کے باوجود' اور تیزی سے قفس کی طرف لپکتا ہے۔ اگر اس کا دروازہ بند پاتا ہے تو اُسے چونچ مار مار کر کھولنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور جب تک پنجرے کے اندر بند نہیں ہو جاتا اسے چین نہیں پڑتا۔ آزاد فضاؤں میں اڑنے والے مرغانِ سحر جب اس کی اس حرکت پر طعنہ زن ہوتے ہیں تو وہ نہایت سکون و اطمینان سے انہیں کہتا ہے کہ تم قفس کی زندگی کی لذتوں کو کیا جانو ـــ

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں ـــ گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

تقلید کی زندگی بڑی سہل انگاری اور تن آسان کی ہوتی ہے۔ اس میں نہ کسی قسم کی علمی کاوش کرنی پڑتی ہے نہ فکری کاہش۔ جو ہوتا چلا آ رہا ہے اس پر آنکھیں بند کر کے چلتے جاؤ اور یہ وظیفہ پڑھتے رہو کہ کل خیرٍ فی اتباع من السلف۔ ہر قسم کی نیکیاں اور بھلائیاں سلف کے اتباع میں ہیں۔ اس سے جھوٹا اطمینان تو ضرور میسر آ جاتا ہے لیکن انسان اپنے مقام سے گر کر خالص حیوانات کی سطح پر آ جاتا ہے۔ وہ شرفِ انسانیت سے محروم ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم نے اسے اسلاف پرستی کی غلامی سے یہ کہہ کر نجات دلائی تھی کہ وہ اپنے وقت پر دنیا سے چلے گئے۔ تم سے ان کی بابت کچھ نہیں پوچھا جائے گا۔ تم سے یہی پوچھا جائے گا کہ تم نے اپنی عقل و بصیرت سے کام لے کر اپنے لئے کیا فیصلے کئے تھے۔

مُردوں کی حالت

یہ تو رہا ائمہ سلف کا معاملہ۔ جہاں تک مُردوں کی غلامی کا تعلق تھا اس نے زندہ انسانوں سے کہا کہ ذرا سوچو کہ جن ہستیوں کو تم اپنا "خدا" سمجھ رہے ہو' ان کی کیفیت یہ ہے کہ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ۔ اگر تم انہیں پکارو تو وہ تمہاری پکار کو سن نہیں سکتے۔ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ (۳۵/۱۴) اور اگر وہ بفرضِ محال تمہاری پکار سن بھی لیں' تو اس کا کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ ان کے عدمِ شعور کی تو یہ کیفیت ہے کہ مَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ (۱۶/۲۱)۔ انہیں خود اپنے متعلق بھی علم نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے۔ لہٰذا ان سے ڈرنا کیوں اور ان سے مرادیں کیوں وابستہ کرنا۔ یہ شرفِ انسانیت کی تذلیل ہے کہ زندہ انسان مردوں سے ڈرتا رہے اور انہیں اپنا حاجت روا تسلیم کرے۔

غور کیجئے، برادران! قرآن نے اس انقلابی اعلان سے انسان کو کس کس نوعیت کی ذلتوں سے بچا لیا! سوچئے کہ کیا ایسا انقلاب اس قابل نہیں کہ اس پر انسان جشنِ مسرت منائے؟۔

روٹی کی محتاجی

انسان کو انسان کے سامنے جھکانے کا ایک اور مؤثر حربہ یہ تھا کہ اُسے روٹی کا محتاج بنا دیا جائے اور اس طرح اُسے بھوکا رکھ کر اس سے اپنا ہر حکم منوا لیا جائے۔ آپ نے سرکس کے شیر کو دیکھا

ہوگا۔ اس میں اتنی قوت ہوتی ہے کہ ایک رنگ ماسٹر تو کیا، وہ جنگلے کے اندر کے تمام آدمیوں کو چبا سکتا ہے۔ لیکن آپ نے دیکھا کہ وہ، اس کے باوجود، رنگ ماسٹر کے ہنٹر کے سامنے کس طرح چیختا اور دھاڑتا ہر وہ حرکت کرتا ہے جس کا اسے اشارہ کیا جاتا ہے؟ یہ کیوں؟ محض بھوک کی وجہ سے۔ یہی حربہ صاحب قوت انسانوں نے، دوسرے انسانوں کو اپنا محکوم بنانے کے لئے اختیار کیا۔ انہوں نے رزق کے سرچشموں پر قبضہ کر لیا اور اس طرح دوسروں کو محتاج بنا کر، ان سے اپنا ہر حکم منوانے لگے۔ اس طرح انسان، شرف آدمیت سے عاری ہو کر، بھوکے حیوانات کی سطح پر آ پہنچا۔

قرآن آیا اور اس نے واضح الفاظ میں اعلان کر دیا کہ رزق کے معاملہ میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محتاج نہیں۔ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ (۶/۱۵۲)۔ ہم تمام افراد کے رزق کے ذمہ دار ہیں۔ اُن کے بھی اور ان کی اولاد کے بھی۔ ہم ایسا نظام معاشرہ قائم کرنے کی ہدایت کرتے ہیں جس میں رزق کے سرچشمے انسانوں کی ملکیت میں رہنے کے بجائے، تمام افراد معاشرہ کی ضروریات زندگی مہیا کرنے کا ذریعہ بنیں۔ اور کوئی کسی کا محتاج و محکوم نہ ہو۔ غور فرمائیے کہ اس اعلان سے، انسان کو کس قدر جانگسل ذلت اور روح فرسا محکومیت سے نجات مل گئی۔ سوچئے برادرانِ گرامی! کہ تاریخ انسانیت کا کیا یہ ایسا انقلاب نہیں جس پر نوع انسان، مسرت کے جشن منائے!

یہ تھی، عزیزانِ من! نزولِ قرآن سے پہلے انسانوں کی حالت ــــ وہ حالت جس میں ہر انسان، اپنے سے زیادہ قوت یا عقلِ فریب کار رکھنے والے انسان کے سامنے جھکتا تھا۔ اور انسان کا انسان کے سامنے جھکنا، شرف انسانیت کی انتہائی ذلت ہے۔ اس لئے کہ

جب جھکا تو غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن۔

اس سے تو انسان کا کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ قرآن نے، انسان کو انسانوں کے سامنے جھکنے اور جھکانے کے تمام دروازے بند کر دیئے۔ یہ تھے وہ تصورات جو قرآن نے دیئے اور اس طرح انسان کو اس کے صحیح مقام سے آگاہ کیا۔ اور اس سے کہدیا کہ اگر تم ان دروازوں کو بند رکھو گے تو تمہیں ایسا معاشرہ میسر آجائے گا جس میں کیفیت یہ ہوگی کہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون۔ جس میں تمہیں نہ کسی قسم کا خطرہ ہوگا نہ خوف و حزن۔ ہر طرح کا اطمینان۔ اور ہر قسم کی سلامتی۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہدیا کہ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں یہ کوئی شاعری نہیں۔ اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَّ مَا هُوَ بِالْهَزْلِ (۸۶/۱۳)۔ یہ ایک فیصلہ کن حقیقت ہے۔ یونہی باد ہوا بات نہیں۔ اس کے بعد کہا کہ تمہیں معلوم ہے کہ ہم نے یہ زنجیریں کیوں توڑی ہیں۔ تمہارے راستے میں حائل شدہ پتھروں کو کیوں ہٹایا ہے۔ یہ سامنے کے پھاٹک کیوں کھول دیئے ہیں؟ یہ اس لئے کہ ہر انسانی بچے کو زندگی کی دوڑ میں مسابقت کے لئے ایک جیسا میدان ملے۔ نہ کسی کو بے جا رعایت ملے۔ نہ کسی کے راستے میں کوئی رکاوٹ آئے۔ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ۔ جس کا جی چاہے اپنی محنت

فیصلہ کن حقیقت

سے آگے بڑھ جائے۔ جس کا جی چاہے نقدانِ عمل سے پیچھے رہ جائے۔ یہاں ہر فیصلہ انسان کے جوہرِ ذاتی اور عملِ پیہم کے مطابق ہو۔ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ (۷۴/۳۸) یہ نہ ہو کہ بڑے باپ کا بیٹا پیدا ہوتے ہی سونے کا چمچہ منہ میں لئے ہو۔ اور غریب کا بیٹا ابتدائی تعلیم تک بھی حاصل نہ کر سکے کیونکہ اس کے باپ کے پاس اسے اسکول میں داخل کرانے کے لئے پیسے نہیں تھے۔ یہ پیدائشی تفریق، برہمن کی خود ساختہ زنجیریں تھیں جن میں وہ شودر کے بچوں کو جکڑے رکھتا تھا۔ قرآن نے انسان کو ان تمام زنجیروں سے آزاد کر دیا۔ قرآن کیا ہے؟ موت کا پیغام ہر نوع غلامی کے لئے۔

یہ تھا برادرانِ عزیز! وہ مقصدِ جمیل و جلیل جس کے لئے نوعِ انسان کو قرآن دیا گیا تھا۔ اور اس سے کہا گیا تھا کہ ایسے منشورِ حریت و آزادی کے ملنے پر جشنِ مسرت مناؤ۔ یعنی انسان کو یہ بتانے کے لئے کہ

مہ و ستارہ سے آگے مقام ہے تیرا۔

بلکہ ـــــ ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا۔ (انسان اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ سے بھی آگے جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ اسے وہ قوت حاصل ہو جائے جو وحی کی راہ نمائی عطا کرتی ہے۔ ۵۵/۳۳)۔

یہ تھا، برادرانِ گرامی قدر! مقصدِ قرآن کی تعلیم کا۔ اس نے ایک ایسا آئینہ دیا جس میں انسان کو، اس کے صحیح خد و خال نکھر کر نظر آ سکتے تھے۔ نبی اکرمؐ نے، اس شیرِ بیشہ کی طرح، ساتھ کھڑے ہو کر، انسان کو، قرآن کے آئینے میں اس کی اصلی شکل سے روشناس کرایا اور اس طرح مردانِ خود آگاہ کی ایک جماعت وجود میں آ گئی اس جماعت نے ایک طرف قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ کر، مظلوم انسانیت کو استبداد ملوکیت سے نجات دلائی، تو دوسری طرف، ایران کے آتشکدوں کی آگ ٹھنڈی کر کے مذہبی پیشوائیت کی زنجیروں کو توڑ کر رکھ دیا۔ اس نے یہودیوں کو خارج البلد کر کے، سرمایہ پرستی کی بساط لپیٹ دی اور شام کی خانقاہوں میں علم و بصیرت کے دئے جلا کر، انسان کے قلب و نظر کی تاریکیوں کو روشنی سے بدل دیا۔ اس طرح اس جماعت کی حق آگہی اور خود شناسی نے انسان کو وہ مقام عطا کر دیا جس کے حصول کے لئے اسے پیدا کیا گیا تھا۔ لیکن ـــــ اور یہ لیکن، کرب و درد کی ایک دنیائے پرسوز اپنے اندر لئے ہوئے ہے ـــــ اس لیکن کو، برادرانِ عزیز! میرے الفاظ میں نہیں، خود قرآن کے الفاظ میں سنئے۔ وَ اتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا ـــ انہیں اس شخص کی عبرت انگیز داستان سناؤ جسے ہم نے اپنے قوانین عطا کئے تھے کہ وہ ان کی روشنی میں مقامِ انسانیت حاصل کرے۔ اس نے ایسا کیا۔ لیکن اس کے بعد فَانْسَلَخَ مِنْهَا۔ وہ انہیں یوں چھوڑ گیا جیسے سانپ کینچلی اتار کر آگے نکل جاتا ہے اور اس پر اس کا نشان تک باقی نہیں رہتا۔ فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ۔ شیطان تو اس کی گھات میں پہلے سے بیٹھا تھا۔ اس نے اسے جا پکڑا اور دوسرے راستے پر ڈال دیا ـــ اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ وَ لَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا

قرآن نے کیا کیا

اس کے بعد کیا ہوا

وَ لٰكِنَّهٗۤ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۔ ہم چاہتے تھے کہ اس قرآن کے ذریعے اسے آسمان کی بلندیوں پر لے جائیں لیکن یہ بدنصیب زمین کی پستیوں کے ساتھ چمٹ کر رہ گیا اور زندگی کے بلند مقاصد کی جگہ اپنی خواہشات ہی کے پیچھے لگ گیا۔ اس ہوس پرستی سے اس کی حالت یہ ہوگئی کہ ہر وقت کتے کی طرح زبان لٹکائے پھر رہا ہے۔ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۔ یہ حالت ہو جاتی ہے اس قوم کی جو ہمارے قوانین کی تکذیب کرتی ہے۔ یعنی وہ ان کا زبان سے انکار نہیں کرتی۔ اس کا تو دعوے کرتی رہتی ہے کہ اس کا ان قوانین پر ایمان ہے لیکن عملاً ان کی تکذیب کرتی ہے۔ یہ ہے برادران عزیز! قرآن کے الفاظ میں ہماری درد انگیز اور عبرت آمیز داستان! اس کے بعد کہا ۔ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (۷/۱۷۵-۷۶) انہیں ان کی داستان سناؤ شاید اسی سے ان میں غور و فکر کرنے کی صلاحیت بیدار ہو جائے اور یہ سوچیں کہ ہم کس آسمان کے ٹوٹے ہوئے تارے ہیں ہم کیا تھے اور اب کیا بن کر رہ گئے ہیں!

یہ کیسے ہوا

یہ کیسے ہوا؟ اس کا جواب خود اس آیت میں موجود ہے۔ اس قوم نے قوانین خداوندی کو اس طرح چھوڑا کہ ان کا کوئی نشان تک ان کی زندگی میں باقی نہ رہا۔ اور یہی وہ شکایت ہے جو حضور نبی اکرمؐ بجناب باری تعالےٰ ان الفاظ میں کریں گے کہ۔ وَ قَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا (۲۵/۳۰)۔ قرآن کو چھوڑا تو دین مذہب میں تبدیل ہو کر رہ گیا۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ اسے علامہ اقبالؒ نے بڑے لطیف اور حسین طنز کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ مذہب کے علمبردار مُلا کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ

عجب نہیں کہ خدا تک تیری رسائی ہو ۔ تیری نگہ سے ہے پوشیدہ آدمی کا مقام

تیرا دعوے ہے کہ تو خدا تک پہنچا ہوا ہے۔ اس کا تو مجھے علم نہیں لیکن اتنا میں ضرور جانتا ہوں کہ تو مقامِ آدمیت سے قطعاً ناآشنا ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ

بآدمے نہ رسیدی ۔ خدا چہ می جوئی!

جو مقامِ آدم سے ناآشنا ہے وہ خداشناس کیسے ہو سکتا ہے ۔ جو اپنے مقام سے واقف نہیں وہ خدا کے مقام سے کیسے واقف ہو سکتا ہے؛ جو اپنے تصورات کے تراشیدہ بتوں کے سامنے جھکتا ہے جو اپنے توہمات کے پیدا کردہ خداؤں کے سامنے جھکتا ہے۔ جو اپنے جیسے انسانوں کے سامنے جھکتا ہے۔ وہ خدا تک کیسے پہنچ سکتا ہے!

اب بھی کچھ نہیں بگڑا

لیکن برادران عزیز! اب بھی کچھ نہیں بگڑا جس قوم کے پاس قرآن موجود ہو ۔ اور قرآن کو تو محفوظ رکھا ہی اسی لئے گیا تھا ۔ اس کے لئے مایوس ہونے کی کونسی وجہ ہو سکتی ہے وہ کہتا ہے کہ فَاسْتَمْسِكْ بِالَّذِيْۤ اُوْحِيَ اِلَيْكَ اِنَّكَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔ اس قرآن کے ساتھ پھر

سے مستمسک ہو جاؤ۔ یہ تمہیں زندگی کے اس راستے پر ڈال دیگا جو سیدھا منزل انسانیت تک پہنچتا ہے۔ وَ اِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَ لِقَوْمِكَ۔ اس سے تمہیں پھر وہی شرف و مجد حاصل ہو جائیگا جو ایک دفعہ حاصل ہوا تھا۔ وَ سَوْفَ تُسْئَلُوْنَ (۴۳/۴۴) خدا کا قانونِ مکافات بہت جلد تم سے پوچھ لیگا کہ تم نے اب کیا کیا تھا یا نہیں۔ یعنی اس کے نتائج مرتب ہونے میں کچھ دیر نہیں لگے گی۔ یہ تو ایسا شجرِ طیب ہے کہ تُؤْتِیْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِیْنٍ (۱۴/۲۵)۔ جو ہر زمانے میں اپنا پھل بدستور دیئے چلا جاتا ہے۔

یہ نغمۂ فصلِ گل و لالہ کا نہیں محتاج ۔۔۔ بہار ہو کہ خزاں ۔۔۔ لا الٰہ الا اللہ

دیر تو تمہاری طرف سے ہی ہے اس کی شاخیں تمہاری طرف جھکی ہوئی ہیں ذرا ہاتھ بڑھاؤ اور پھل تمہاری جھولی میں ہوگا۔ قرآن میں ہر وقت اس کی صلاحیت موجود ہے کہ یہ انسان کو اس کا صحیح مقام عطا کر دے۔

گر زمینی آسماں سازو ترا ۔۔۔ آں چہ حق می خواہد آں سازو ترا
خستہ باشی، استوارت می کند ۔۔۔ پختہ مثل کوہسارت می کند
نوعِ انسان را پیامِ آخریں ۔۔۔ حاملِ او رحمۃ اللعالمینؐ

لہٰذا سوچئے برادرانِ عزیز! کہ انسان کو اگر اس قسم کا نسخہ ہاتھ آجائے جس سے اُسے کائنات میں یہ مقام حاصل ہو جائے تو اس کے لئے یہ تقریب جشنِ مسرت منانے کی ہے یا نہیں؟ آج قرآن کی عظمت و اہمیت ہماری نگاہوں کے سامنے اس لئے نہیں آتی کہ ہم مقامِ آدمیت کی عظمت و رفعت ہی سے ناآشنا ہو چکے ہیں۔ اس لئے یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ ہم عید کیوں مناتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے جو اقبال نے کبھی بایں درد و کرب کہا تھا کہ

پیامِ عیش و مسرت ہمیں سناتا ہے ۔۔۔ ہلالِ عید ہماری ہنسی اڑاتا ہے

برادرانِ من! اگر یہ دیکھنا ہو کہ اب ہلالِ عید ہماری کس طرح ہنسی اڑاتا ہے، تو چار دن کے بعد اپنے اجتماعِ عید پر طائرانہ نگاہ ڈالیئے گا حقیقت ابھر کر سامنے آجائے گی۔ کچھ دور کی بات نہیں کہ عید کے اجتماع میں کم از کم ہر فرد نئے کپڑے پہن کر آتا تھا۔ ہر بچے کو خوشنما لباس اور نیا جوتا مل جاتا تھا۔ اب حالت یہ ہو گئی ہے کہ آپ اس اجتماع میں نوے فیصد افراد (اور بچوں) کو پرانے کپڑوں میں ملبوس دیکھیں گے۔ بات یہ چھوٹی سی ہے، لیکن آئینہ دار ہے ایک بہت بڑی حقیقت کی جس قوم کے افراد اپنی بنیادی ضروریاتِ زندگی تک سے محروم ہو رہے ہوں، اسے کیا معلوم کہ مقامِ آدمیت کیا ہوتا ہے؟ وہ تو آسمان کی رفعتوں کا نام ہے اور یہاں زمین کی پستیاں بھی نصیب نہیں!! غیر شعوری طور پر ہماری حالت یہ ہو چکی ہے کہ ہم عید کی نماز تو (رسماً و کرہاً) پڑھ آتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد سمجھ میں نہیں آتا کہ دن کیسے کاٹیں۔

ہماری عید

یہ کسی قوم کی قلبی کیفیت کے ماپنے کا بہت ادنیٰ معیار ہے۔ لیکن میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ جو قوم اس معیار پر بھی پوری نہ اترے، وہ کیا جانے کہ مقامِ آدمی کیا ہے! سوچئے کہ قرآن کو چھوڑ کر ہم کہاں پہنچ چکے ہیں۔ آپ دلوں کو ٹٹول کر دیکھئے۔ ہزار میں ایک دل بھی ایسا نہیں ملے گا۔ جس میں حقیقی مسرت کی کوئی کرن دکھائی دے ۔۔۔ یہ کم نگاہی۔ یہ بے سوادی!

لیکن جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے، اس میں مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ آپ مذہب کو چھوڑ کر دین اختیار کیجئے۔ افسانہ تراشیوں سے منہ موڑ کر قرآنی حقائق کو اپنا لیجئے۔ اور پھر دیکھئے کہ عید کی حقیقی مسرتیں کس طرح آپ کے لئے وجہِ نشاطِ روح بنتی ہیں۔ آیئے ہم اپنے قلب کی گہرائیوں سے اس مقدس آرزو کو ابھاریں اور اُن حسین الفاظ میں زبان پر لائیں جنہیں برادرِ عزیز خلیل صاحب، ہمارے ہر اجتماع میں نشیدِ زندگی بنایا کرتے ہیں۔ کہ

لا پھر اک بار وہی بادہ و جام اے ساقی
ہاتھ آجائے مجھے میرا مقام اے ساقی

ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم

قانون کی حکمرانی

محترم پرویز صاحب کی تقریر جس سے

انہوں نے طلوعِ اسلام کنونشن منعقدہ، نومبر ۱۹۶۴ء

کے کھلے اجلاس سے خطاب کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قانون کی حکمرانی

وہ غالباً (مشہور مغربی مفکر) لاک تھا جس نے کہا تھا کہ تم مجھے یہ بتا دو کہ فلاں قوم نے اپنی پرستش کیلئے کس قسم کا خدا تجویز کر رکھا ہے، اور میں تمہیں اس قوم کی تہذیب و تمدن کے متعلق سب کچھ بتا دوں گا۔ اس مفکر نے بات بڑی پتے کی کہی ہے۔ "معبود" یا تو ذہن انسانی کا تراشیدہ ہوگا، اور یا اُسے ذہن انسانی نے قابلِ قبول سمجھا ہوگا۔ دونوں صورتوں میں، وہ اس قوم کی ذہنی سطح اور نفسیاتی اُفتاد کا آئینہ دار ہوگا جس نے اسے اپنی پرستش کیلئے اختیار کر رکھا ہوگا۔ اور چونکہ "معبود" کا مقام، قوم کے تصور میں بلند ترین ہوتا ہے، اس لئے اُس قوم کی تہذیب و تمدن کے خط و خال لازماً اُس (معبود) کی خصوصیات سے متاثر ہوں گے۔ بلکہ یوں کہئے کہ وہ اس کے سانچے میں ڈھلے ہوں گے۔ اگر آپ انسانی تاریخ کا مطالعہ اس نگاہ سے کریں گے تو آپ دیکھیں گے کہ وہ اس دعوے کی صداقت کے لئے بین شہادات پیش کرتی ہے۔ آپ اپنے ہمسایہ ملک (ہندوستان) کو دیکھئے۔ ان کے ہاں

ہندوؤں کے معبود

بادل، بجلی، بارش، سورج، ہوا، زمین، دریا، درخت، گائے، سب دیوی دیوتا مانے جاتے تھے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ معبود اس قوم کے ذہن کے تراشیدہ تھے جو زراعت پیشہ تھی۔ فطرت کی جو قوت، کھیتی کے لئے مفید نظر آئی، انہوں نے اس کے چرنوں (قدموں) میں اپنی شردھا (عقیدت) کے پھول نچھاور کر دیئے۔ جو قوت، ضرر رساں ہوئی، اس کے ڈر سے، اس کے سامنے ڈنڈوت بجا لائے (جھک گئے) اس سے آگے بڑھے تو انہوں نے زندگی کو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر دیا اور ہر شعبہ کے لئے جداگانہ خدا تجویز کر لیا — برہما، پیدا کرنے والا۔ وشنو، پرورش کرنے والا۔ اور شیوجی، فنا کرنے والا۔ زندگی کی

یہی تقسیم ان کے معاشرہ کی بنیاد بن گئی اور انسان، برہمن۔ کھشتری۔ ویش۔ شودر کے ورنوں میں منقسم ہو گیا۔ اس تقسیم کا

ورنوں کی تقسیم

نتیجہ یہ تھا کہ معاشرتی معاملات میں تمام انسانوں کے لئے ایک جیسا قانون نہیں تھا۔ ایک ہی جرم کی سزا، برہمن، کھشتری، ویش اور شودر کے لئے الگ الگ تھی۔ اگر کوئی اچھوت کسی اونچی ذات والے کو چھو بھی لے تو وہ موت کی سزا کا مستوجب ہو جاتا تھا لیکن برہمن کسی کو قتل بھی کر ڈالے تو اسے سزائے موت نہیں دی جا سکتی تھی۔ لین دین کے معاملات تک میں یہ حالت تھی کہ اگر برہمن قرض لے تو اس سے ۲۴ فی صد سود لیا جاتا تھا۔ کھشتری سے ۳۶ فی صد۔ ویش سے ۴۸ فی صد اور شودر سے ۶۰ فی صد۔ رگوید میں یہانتک لکھا ہے کہ

> اگر کسی عورت کے پہلے دس غیر برہمن خاوند موجود ہوں اور برہمن اس کا ہاتھ پکڑ لے تو وہی اکیلا اس کا خاوند سمجھا جائے۔ کیونکہ برہمن ہی عورتوں کا مالک یا خاوند ہے نہ کہ کھشتری اور ویش وغیرہ۔

ورنوں کی یہ تقسیم پیدائشی تھی جس پر کسی کو کچھ اختیار نہیں تھا اور نہ ہی یہ بعد میں کسی حسن تدبیر یا نیک عملی سے مٹائی جا سکتی تھی۔ اس کے لئے یہ عقیدہ وضع کیا گیا تھا کہ برہمنوں کو برہما (خدا) نے اپنے سر سے پیدا کیا ہے۔ کھشتریوں کو اپنے بازوؤں سے۔ ویش کو اپنے پیٹ سے اور شودروں کو اپنے پاؤں سے۔ یہ تفریق برہما نے اپنی مرضی سے کی ہے جس میں کسی کو کوئی دخل نہیں ہو سکتا۔

مستبد حکمران

اس سے ان کے ہاں مستبد حکمرانوں کا تصور وجود میں آیا جس کی وجہ سے راجہ کو ایشور (خدا) کا اوتار سمجھ لیا گیا۔ "ایشور کا اوتار" سمجھنے کے معنی یہ تھے کہ راجہ کے ہر حکم کی تعمیل بلا چون و چرا کی جائے گی۔ اس سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ اس کے حکم کی علت اور حکمت کیا ہے۔ ہم اس کی اطاعت کیوں کریں۔ ہم اس کے سامنے کیوں جھکیں۔ اس لئے کہ جس قسم کا آمر مطلق خدا، اسی قسم کا ڈکٹیٹر اس کا اوتار۔

یہودیوں نے اپنے لئے جس "خدا" کو تجویز کیا اس کی تنگ نظری کا یہ عالم تھا کہ وہ تھا ہی بنی اسرائیل کا خدا۔ کسی اور کا نہیں تھا۔ اور بنی اسرائیل اس کی چہیتی اولاد تھی۔ اس کا نتیجہ یہ کہ یہودیوں کو اپنی قوم کے علاوہ

یہودیوں کا معبود

دنیا کی ہر قوم سے نفرت پیدا ہو گئی۔ پھر ان کا "خدا" ہاتھ میں آتشیں کوڑا لئے، ہر شخص سے اپنا حق وصول کرنے کے درپے تھا۔ نہ اس کے سینے میں دل تھا نہ دل میں لوچ اور لچک۔ اس "خدا" کا پرستار، مرچنٹ اوف وینس" کے ڈرامے کا وہ کردار تھا جو اپنے قرضے کے بدلے میں، انسانی گوشت کا ٹکڑہ کاٹنے کے لئے خنجر بدست رہتا تھا۔ (Joseph Whebs) کے الفاظ میں

تورات کا خدا بے شمار قاتلوں کے بہائے ہوئے خون سے ہولی کھیلتا نظر آتا ہے۔ وہ خود بھی قاتل اور مفسد ہے۔ چور، غدار، انتقام کے جذبے میں ایک خونخوار عفریت۔ گنہگار اور بے گناہ دونوں کو، بے رحمی سے سزا دینے والا۔ نہایت مہیب اور خوفناک۔ ظلم اور تعصب کا مجسمہ۔ متکبر اور شیخی باز۔ وعدہ خلاف۔ غلط بیان اور ڈھٹائی سے جھوٹ بولنے والا۔

(IS IT GOD'S WORDS)

آپ دیکھئے کہ خدا کا یہ تصور، کس طرح یہودیوں کی پوری تاریخ کی ترجمانی کر رہا ہے۔ جب قوت ان کے ہاتھ میں تھی تو وہ کس قدر مہیب، خوفناک، ظالم اور خونخوار قوم تھی۔ اور جب ان کے ہاتھ سے قوت چلی گئی تو وہ کیسی بددیانت۔ وعدہ فراموش۔ جھوٹی۔ تنگ نظر اور سازشی قوم بن کر سامنے آئی۔ نہ اُس وقت ان کے سامنے قانون اور عدل کا تصور تھا۔ نہ حالات بدلنے پر ان کے پیش نظر آئین وضوابط کا احترام۔ علاوہ بریں، تورات میں جو

تورات کا قانون

قانون دیا گیا ہے اس میں بنی اسرائیل اور غیر بنی اسرائیل میں کھلی ہوئی تفریق کی گئی ہے۔ مثلاً تورات کی کتاب استثنا میں ہے کہ اگر کسی اسرائیلی نے اپنے بھائی کو قرضہ دیا ہو تو سات سال کے بعد اسے وہ قرضہ معاف کر دینا ہوگا۔ لیکن غیر بنی اسرائیل سے اس کا مطالبہ بدستور رہیگا۔ (استثنا ۱۵/۳)۔ اسی کتاب میں دوسری جگہ ہے کہ بنی اسرائیل کو بلاسود قرض دیا جا سکتا ہے لیکن غیر بنی اسرائیل کو نہیں دیا جا سکتا۔ (۲۳/۲۰)۔ اسی طرح اگر کوئی شخص بنی اسرائیل کے کسی بچے کو اغوا کرلے تو اس کی سزا موت تھی۔ لیکن غیر بنی اسرائیل کے بچے کے سلسلہ میں کسی سزا کا ذکر نہیں۔ (۲۱/۱۶)۔ بنی اسرائیل اور غیر بنی اسرائیل کی یہی وہ تفریق ہے جس کے سلسلہ میں قرآن کریم میں ہے کہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ غیر بنی اسرائیل کے ساتھ اگر بددیانتی کرلی جائے تو اس کا کچھ مواخذہ نہیں ہوگا۔ (۳/۷۵)۔ یہ تفریق خدا کے اس تصور پر مبنی ہے جسکی رو سے سمجھا جاتا ہے کہ وہ صرف بنی اسرائیل کا خدا ہے اور بنی اسرائیل اس کی چہیتی اولاد ہے۔

عیسائیوں نے اپنے لئے جس "خدا" کو بطور معبود تجویز کیا اس کی کیفیت عجیب ہے۔ اس کی

عیسائیوں کا خدا

رو سے ہر انسانی بچہ پیدائشی طور پر گنہگار ہوتا ہے — اپنے کسی تصور کی وجہ سے نہیں۔ اس کے اولیں ماں باپ نے جو گناہ کیا تھا، اس کی پاداش میں — یعنی اس خدا کی عدالت ایسی ہے کہ اس میں بے گناہوں کو مجرم ٹھیرایا جاتا ہے۔ اور مجرم بھی ایسا کہ وہ ہزار کوشش کرے، اس کلنک کا ٹیکہ اس کے ماتھے سے اتر ہی نہیں سکتا۔ اس کے بعد اس خدا کے متعلق یہ تصور قائم کیا گیا کہ جب

اس نے دیکھا کہ تمام انسان گنہگار پیدا ہو رہے ہیں اور گنہگار ہی مرتے ہیں اور اس معاملہ میں وہ بالکل بے بس ہیں، تو اسے اپنی مخلوق کی اس بے چارگی پر ترس آگیا اور اس نے ان کی حالت پر رحم کھا کر، اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی دیدی تاکہ اس کا خون ان لوگوں کے گناہوں کا کفارہ بن جائے۔ جو لوگ حضرت مسیحؑ کے کفارہ پر ایمان لے آئیں، ان کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ جو ایسا نہ کریں وہ اپنے اولیں ماں باپ کے گناہ کی پاداش میں جہنم میں دھکیل دیئے جاتے ہیں۔ آپ نے غور فرمایا کہ خدا کے اس تصور میں، قانون کا کوئی شائبہ تک نہیں۔ نہ انسان کے جہنم رسید ہونے میں اس کے اعمال کو کوئی دخل ہے۔ نہ اس سے نجات ملنے میں کسی عمل کا کوئی واسطہ۔ چنانچہ سینٹ پال، افسیوں کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

تم کو ایمان کے وسیلے ہی سے نجات ملی ہے۔ اور یہ تمہاری طرف سے نہیں۔ خدا کی بخشش ہے۔ نہ اعمال کے سبب سے ہے۔ (افسیوں ۲/۸-۹)

اس سے بھی واضح تر الفاظ میں۔

جتنے لوگ شریعت کے اعمال پر تکیہ کرتے ہیں وہ سب لعنت کے ماتحت ہیں۔ چنانچہ لکھا ہے کہ جو کوئی ان سب باتوں کے کرنے پر قائم نہیں رہتا جو شریعت کی کتاب میں لکھی ہیں، وہ لعنتی ہے۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ شریعت کے وسیلے سے کوئی شخص خدا کے نزدیک راستباز نہیں ٹھیرتا۔ کیونکہ لکھا ہے کہ راستباز ایمان سے جیتا رہیگا اور شریعت کو ایمان سے کچھ واسطہ نہیں.... مسیح جو ہمارے لئے (معاذ اللہ) لعنتی بنا اس نے ہمیں مول لے کر شریعت کی لعنت سے چھڑا دیا۔ (گلتیوں ۳/۱۰-۱۳)

اس قسم کے خدا کے تصور نے، عیسائی اقوام کی تمدنی زندگی پر جو اثر ڈالا، اس کے متعلق ہسپانیہ کا نامور پروفیسر (DR. F. DE GRACIA) کے الفاظ سنئے، جنہیں برفو (BRIFAULT) نے اپنی کتاب (THE MAKING OF HUMANITY) میں نقل کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

عیسائیت میں عدل کا تصور نہیں

عیسائیت میں عدل کا تصور بھی اسی طرح نامانوس ہے جس طرح ذہنی دیانت کا۔ یہ اس کے تصورِ اخلاق سے باہر کی چیز ہے۔ عیسائیت نے ان لوگوں سے تو شفقت اور ہمدردی کا اظہار کیا جن پر ظلم و ستم ہوں لیکن خود ظلم و ستم کی طرف سے ہمیشہ چشم پوشی کی..... سینٹ وِنسنٹ فرانس کے اُس قید خانے کا معائنہ کرتا ہے جو دُنیا میں جیتا جاگتا جہنم ہے۔ وہ وہاں محبت کا پیغام عام کرتا ہے

اور گنہگاروں کو توبہ کی تلقین کرتا ہے۔ لیکن اُسے اس ظلم و استبداد کا احساس تک نہیں ہوتا جس پر اس جہنم کا قیام ہے۔..... عدل و انصاف اور حق و باطل کی نظر سے عیسائیت کی روح یکسر بے حس ہے۔ (صفحہ ۳۳۲—۳۳۳)۔

چونکہ نجات کا دارومدار، حضرت مسیحؑ کے کفارہ کے عقیدہ پر ٹھہرا نہ کہ انسان کے اپنے اعمال پر، اس لئے عیسائی معاشرہ میں ہر قسم کا جھوٹ اور فریب وہی، کارِ ثواب سمجھا جانے لگا۔ چنانچہ سینٹ پال رومیوں کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں کہ۔

اگر میرے جھوٹ کے سبب سے خدا کی سچائی اس کے جلال کے واسطے زیادہ ظاہر ہوتی ہے تو پھر مجھ پر گنہگار کی طرح کیوں حکم دیا جاتا ہے۔ اور ہم کیوں برائی نہ کریں تاکہ بھلائی پیدا ہو۔ (رومیوں کے نام ۳/۷)

جب اس طرح معاشرہ میں برائیاں عام ہونے لگیں اور جھوٹ اور فریب کے بازار کھل گئے، تو انہیں بخشوانے کے لئے، معافی ناموں کے خریدنے کا عقیدہ وضع کیا گیا۔ ان کی ابتدا یوں ہوئی کہ صلیبی جنگوں کے دوران میں پوپ اربن دوم (URBAN - II) نے حکم جاری کیا کہ جو لوگ بذاتِ خود شریک جنگ نہیں ہو سکتے، وہ اپنی طرف سے کسی اور کو بھیجدیں اور اس کے بدلے میں انہیں معافی نامہ دے دیا جائے گا جو ان کی نجات کا کفیل ہوگا۔ جب پوپ (Leo - X) نے روما میں سینٹ پیٹر کا گرجا بنوانا چاہا

معافی نامے

تو اس نے بھی اسی قسم کے معافی نامے بیچنے شروع کر دیئے۔ بس پھر کیا تھا؟ ان معافی ناموں نے عام تجارت کی شکل اختیار کر لی اور ہر جگہ ان کی فروخت کے لئے ایجنسیاں قائم ہو گئیں۔ ہر گناہ کی معافی کے لئے الگ قیمت کا معافی نامہ موجود تھا۔ ان معافی ناموں کی عام فارم یہ ہوا کرتی تھی

تم پر خداوند یسوع مسیح کی رحمت ہو اور وہ تمہیں اپنے مقدس ترحم خسروانہ سے تمام گناہوں کی پاداش سے آزاد کر دے۔ میں اس کی، اور اس کے بابرکت شاگرد، پطرس۔ پولوس۔ اور مقدس پوپ کی اس سند کی رُو سے جو مجھے انہوں نے عطا فرمائی ہے تمہیں آزاد کرتا ہوں، سب سے پہلے کلیسا کی تمام ملامتوں سے خواہ وہ کسی شکل میں ہوں۔ پھر تمہارے ہر قسم کے گناہ، حدود شکنی اور زیادتی سے، خواہ وہ کیسے ہی ہیبت اور شدید کیوں نہ ہوں۔ اور میں وہ سزا تم سے اٹھا لیتا ہوں جو تمہیں تمہارے گناہوں کی پاداش میں جہنم میں ملنے والی تھی تاکہ جب تم مرو تو جہنم کے دروازے تم پر بند ہوں اور جنت کی

راہبِ کشادہ — باپ، بیٹے اور روح القدس کے نام پر..... تم بارہ پینس کے عوض اپنے باپ کی روح کو جہنم سے نکلوا سکتے ہو۔ کیا تم ایسے ناخلف ہو کہ اپنے باپ کے لئے اس قدر سستی نجات بھی نہیں خرید سکتے۔ اگر تمہارے پاس اور کچھ نہیں فقط ایک کوٹ ہے تو وہی اتار دو تاکہ اس قدر گراں بہا متاع خرید سکو۔"

حوالہ کے لئے دیکھئے (Buck's Theological Dictionary -Indulgences)

برادرانِ عزیز! آپ اس داستان سے گھبرا نہ جائیے کہ دوسروں کے قصوں سے ہمیں کیا واسطہ۔ آپ آگے چل کر دیکھیں گے کہ یہی تصورات کس طرح آپ کے ہاں بھی اسلام کا جزو بن گئے۔

مجوسیوں کا معبود

مجوسیت میں خدا کا تصور ایک مستبد، مطلق العنان، ڈکٹیٹر کا سا ہے جو قہرمانیت کا مجسمہ بنے، ایک عظیم تخت پر بیٹھے، جس قسم کے جی میں آئے، احکام نافذ کرتا رہتا ہے۔ اس کے اردگرد مقربین کی جماعت رہتی ہے جسے اس کے مزاج میں خاصا دخل ہوتا ہے۔ وہ سفارش کر کے، مجرمین کو چھڑا دیتے ہیں اور رشوت لے کر بے گناہوں کو پھنسا دیتے ہیں۔ عام انسانوں کی اس تک رسائی نہیں ہو سکتی۔ انہیں اپنی درخواستیں، اس کے حاجب و دربان کے گروہ کی وساطت سے بھینٹ پیش کرتی ہیں اور وہ اس کے لئے خلعے نذرانے وصول کرتے ہیں۔ اس کے فیصلوں کے لئے نہ کسی قاعدے کی ضرورت ہے نہ قانون کی۔ نہ وہ کسی آئین کا پابند ہے نہ ضابطہ کا — خدا کے اس تصور کا نتیجہ تھا کہ ایران میں شخصی حکومت کا دور دورہ رہا۔ ان کا شاہنشاہ، اِسی خدا کا زمین پر سایہ ہوتا تھا۔ یا یوں کہئے کہ ان کا خدا، اس شاہنشاہیت کا آسمان پر پرتو ہوتا تھا۔

جس قسم کا خدا اسی قسم کی تہذیب

آپ نے غور کیا برادران! کہ جس قسم کا معبود کسی قوم نے اختیار کر رکھا ہو، اس قوم کی تہذیب و تمدن پر اس کا اثر کس قدر گہرا ہوتا ہے۔ یہ تمام معبود جن کا مختصر سا تعارف اوپر کرایا گیا ہے، ذہن انسانی کے تراشیدہ خدا تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان قوموں کی طرف وحی کی راہ نمائی آئی تھی جس نے انہیں خدا کا صحیح تصور دیا تھا۔ لیکن وہ وحی ان کے ہاں باقی نہ رہی اور اس کے ساتھ ہی خدائے حقیقی کا تصور بھی ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ لہٰذا، ان کے جن معبودوں کا تعارف اوپر کرایا گیا ہے، وہ وحی کا پیش کردہ خدا نہیں تھا۔ ان لوگوں کے اپنے تصور کا خدا تھا۔ وحی کی رُو سے پیش کردہ خدا کا تصور صرف قرآن کریم میں ملتا ہے جو اپنی اصلی اور حقیقی شکل میں محفوظ چلا آتا ہے اور اسی طرح محفوظ چلا جائے گا کیونکہ اسکی حفاظت کا

قرآن کا خدا

ذمہ خود خدا نے لے رکھا ہے اور تاریخ اس پر شاہد ہے کہ اس میں ایک حرف کا ردوبدل کبھی نہیں ہوا۔ آئیے ہم دیکھیں کہ اس خدا کا کس قسم کا تصور ہمارے سامنے آتا ہے۔ جہاں تک خدا کی قوت، اختیار اور اقتدار کا تعلق ہے، قرآن کریم نے بتا دیا ہے کہ وہ لامحدود ہیں۔ ان کی حدود نہایت نہیں۔ ان کی وسعتوں کا کوئی شخص اندازہ نہیں لگا سکتا۔ یہی وہ لامحدود اختیارات ہیں جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ یَفْعَلُ اللّٰہُ مَا یَشَآءُ (۱۴/۲۷) اپنی مرضی کے مطابق جو چاہے کرتا ہے وَ یَحْکُمُ مَا یُرِیْدُ (۵/۱)۔ وہ اپنے ارادے کے مطابق جو چاہے کرتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ اس نے کائنات کو پیدا تو اپنی منشاء اور مرضی کے مطابق کیا ہے لیکن اس کے نظم و نسق کے لئے اس نے قوانین وضع کر دیئے ہیں اور وہ ان قوانین کی خلاف ورزی کبھی نہیں کرتا۔ اس نے خود ہی اپنے لامحدود اختیارات پر اپنے وضع کردہ قانون کی پابندی عائد کر رکھی ہے۔

کائناتی قوانین

قانون کے لئے قرآن کریم میں قدر کا لفظ آیا ہے جس کے معنی اندازے اور پیمانے کے ہیں۔ قَدْ جَعَلَ اللّٰہُ لِکُلِّ شَیْءٍ قَدْرًا (۶۵/۳)۔ "اللہ نے ہر شے کے لئے پیمانے مقرر کر دیئے ہیں"۔ اب کائنات کی عظیم القدر مشینری انہی پیمانوں اور اندازوں کے مطابق چلتی ہے۔ اسی کو خدا نے "سنت اللہ" کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی خدا کی عادت یا روش۔ اور اس روش کے متعلق کہہ دیا کہ وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبْدِیْلًا (۳۳/۶۲)۔ تم خدا کی اس عادت یا روش میں کبھی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔ خارجی دنیا میں انہیں خدا کے غیر متبدل قوانین فطرت کہا جاتا ہے۔ غور کیجئے۔ یہ کتنی بڑی پابندی ہے جسے خدا نے خود اپنے اختیار مطلق پر عائد کر لیا ہے۔ واضح رہے کہ جو پابندیاں از خود عائد کر لی جائیں ان سے اس شخص کے اختیار و ارادہ پر کوئی حرف نہیں آتا۔ مثلاً ایک شخص کو تھانیدار حکم دیتا ہے کہ وہ ہر روز صبح، فلاں وقت پر فلاں جگہ پہنچ کر حاضری دیا کرے۔ ظاہر ہے کہ اس حکم کی پابندی، محکومی کہلائے گی۔ لیکن ایک شخص خود فیصلہ کرتا ہے کہ وہ ہر روز صبح، سیر کرتا ہوا فلاں مقام پر فلاں وقت پہنچا کرے گا۔ اور وہ التزاماً ایسا کرتا ہے۔ اس میں کبھی تبدیلی نہیں کرتا۔ اس پابندی کو محکومی نہیں کہا جائے گا۔ بلکہ جو شخص اپنی زندگی خود عائد کردہ پابندیوں کے مطابق بسر کرتا ہے اور ان میں کبھی تبدیلی نہیں کرتا، تو ایسے شخص کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ بڑا اصول پرست ہے۔ لہٰذا، کائنات کے نظم و نسق کے لئے قوانین وضع کر کے، اس کے مطابق چلنے سے، خدا کے اختیارات پر کوئی حرف نہیں آتا۔

قانون کسے کہتے ہیں

قانون (یا LAW) کسے کہتے ہیں، اسے انگریزی زبان کے تین لفظوں سے سمجھا جا سکتا ہے۔ یعنی

— THEN—ALWAYS

یعنی اگر ایسا کرو گے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا۔ اور ہمیشہ وہی نتیجہ نکلے گا۔ بالفاظ دیگر قانون کے معنی یہ ہیں کہ اس کی رو سے ہر عمل کا نتیجہ متعین ہوتا ہے۔ جب بھی وہ عمل سرزد ہوگا، وہی نتیجہ مرتب ہوگا۔ اسی کو عدل کہا جاتا ہے۔ یعنی ہر عمل کا نتیجہ اس سے متعلق قانون کے مطابق مرتب ہونا — گندم از گندم بروید جو ز جو — قانونِ فطرت اور نظامِ عدل کی صحیح تفسیر ہے۔

خدا پر ایمان

یہ ہے خدا کا وہ تصور جسے قرآن نے پیش کیا اور کہا کہ اگر تم اس تصور کے مطابق خدا پر ایمان لاؤ تو اسے خدا پر ایمان سمجھا جائے گا۔ اگر خدا کے متعلق تصور کچھ اور ہے تو قرآن اسے ایمان باللہ تسلیم ہی نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دنیا کے تمام انسانوں سے، خواہ وہ اپنے اپنے طور پر خدا کو مانتے ہی کیوں نہ ہوں، خدا پر از سرِ نو ایمان لانے کا مطالبہ کرتا ہے اور واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا (۲/۱۳۷)۔ اگر یہ لوگ خدا پر اس طرح ایمان لائیں جس طرح (اے جماعتِ مؤمنین) تم ایمان لائے ہو، تو پھر یہ کہا جائے گا کہ یہ صحیح راستے پر ہیں۔ اسی سے ضمناً یہ بات بھی سمجھ میں آجائے گی کہ یہ جو آجکل نعرہ لگایا جاتا ہے کہ۔ (BELIEVERS IN GOD UNITE TOGETHER)۔ قرآن کی رُو سے وہ کس قدر فریب انگیز ہے۔ قرآن کریم کی رو سے (BELIEVERS IN GOD) صرف وہی لوگ سمجھے جا سکتے ہیں جو خدا کے متعلق وہ تصور رکھیں جسے اس نے خود اپنے متعلق دیا ہے اور جو قرآن کے اندر محفوظ ہے۔ یہ تصور کیا ہے؟ دو لفظوں میں یہ کہ کائنات میں خدا کی حکمرانی ایک آمرِ مطلق (ABSOLUTE DICTATOR) کی سی نہیں۔ بلکہ ایک ایسے حاکم کی ہے جو ہر بات قاعدے اور قانون کے مطابق کرتا ہے اور اس کے خلاف کبھی نہیں کرتا۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ کائنات میں ہر عمل کا نتیجہ وہی مرتب ہوتا ہے جو متعلقہ قانون کی رو سے اس کے لئے متعین کر دیا گیا ہے۔ خارجی کائنات میں خدا کے یہ قوانین از خود جاری و ساری ہیں۔ لیکن انسانوں کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہیں تو اپنی زندگی ان قوانین کے مطابق بسر کریں اور چاہیں تو ان کے خلاف روش اختیار کر لیں۔ وہ جونسی روش اختیار کریں گے، اس کے مطابق نتائج مرتب ہوں گے، یعنی جس طرح خدا نے قوانین کی رُو سے، از خود اپنے اختیارات پر پابندی عائد کر لی، اسی طرح انسانوں کو بھی چاہیئے کہ اپنی مرضی سے، اپنے اختیارات کو ان قوانین کی حدود کے اندر رکھیں جو خدا نے ان کے لئے مقرر کر دیئے ہیں۔ لاک نے کہا تھا کہ جس قسم کا خدا، کوئی قوم اپنے لئے تجویز یا اختیار کر لے، اسی قسم کا اس قوم کا معاشرہ ہوگا۔ آپ سوچیئے کہ جب کوئی قوم اس خدا کو اپنا الٰہ مان لے گی جس کے ہاں حکومت قانون کی ہے، اس قوم کے

معاشرہ میں بھی کس طرح قانون کی حکومت کارفرما ہوگی۔ آیئے ہم دیکھیں کہ نظامِ کائنات میں خدا کے قانون کی حکومت کس طرح کارفرما ہے تاکہ اس سے اندازہ ہو سکے کہ اس قسم کے خدا پر ایمان رکھنے والی قوم کا معاشرہ کس قسم کا ہوگا۔

کائنات میں یہ قانون کی حکومت کس طرح کارفرما ہے' اسے ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ آگ میں اُنگلی ڈالیے تو وہ جل جاتی ہے اور اس کے جلنے سے سخت تکلیف ہوتی ہے۔ یہ فطرت کا قانون ہے۔ اب دیکھئے کہ یہ قانون کس طرح کارفرما ہوتا ہے۔

کائناتی نظامِ عدل

(۱) اگر آپ لوگوں کے سامنے آگ میں انگلی ڈالیں گے تو بھی وہ جل جائے گی۔ اور اگر کسی کمرے کی تنہائیوں میں ـــ یعنی جہاں کوئی دیکھنے والا نہ ہو ـــ ایسا کریں گے' وہ تب بھی جل جائے گی۔ بالفاظ دیگر' اس جرم کی سزا کے لئے نہ کسی گواہ کی ضرورت ہوگی۔ نہ پولیس یا خارجی عدالت کی۔

(۲) یہ بھی نہیں ہوگا کہ اگر آپ اس کا اقرار کریں کہ میں نے واقعی آگ میں انگلی ڈالی تھی' تو آپ کو درد نہ ہو۔ اور اگر اس جرم کے ارتکاب سے انکار کر دیں تو آپ اس تکلیف سے بچ جائیں۔ اس جرم کی سزا بہرحال آپ کو مل کر رہے گی۔

(۳) اگر آپ چاہیں کہ کسی کو ہزاروں روپے بطور رشوت دے کر اس سزا سے بچ جائیں' تو اب کبھی نہیں ہو سکے گا۔

(۴) یا آپ کسی بڑے سے بڑے صاحب اختیار ـــ حتیٰ کہ صدر مملکت تک ـــ کی سفارش لے آئیں' تو بھی آپ اس تکلیف سے نہیں بچ سکتے۔

(۵) نہ ہی ایسا ہو سکتا ہے کہ آگ میں انگلی آپ ڈالیں اور درد کسی اور کے ہونے لگ جائے۔ یا اگر آپ کا کوئی عزیز ترین دوست اور غمخوار بھی چاہے کہ آپ کے اس درد کو بٹا لے تو ایسا کبھی نہیں ہو سکے گا۔

انسانی نظامِ عدل

اس کے برعکس' آپ یہ دیکھئے کہ انسانوں کے نظامِ عدل میں بالعموم ہوتا کیا ہے؟ اس میں ہوتا ہے کہ

(۱) اگر آپ کسی ایسی جگہ ارتکابِ جرم کرتے ہیں جہاں کوئی دیکھنے والا نہ ہو' تو آپ اس جرم کی سزا سے بچ جاتے ہیں۔

(۲) اگر آپ پولیس کی گرفت میں آجاتے ہیں' لیکن کسی طرح ان پر کوئی اثر ڈال سکتے ہیں تو ہو سکتا ہے کہ آپ کا چالان ہی نہ ہو اور یوں آپ اس جرم کی سزا سے بچ جائیں۔

(۳) اور اگر بات عدالت تک پہنچ جائے تو وہاں وکیلوں کی موشگافیاں گواہوں کا انحراف۔ آپ کی غلط بیانیاں یا پھر عدالت پر (سفارش یا رشوت کے ذریعہ) اثر اندازی۔ ان باتوں کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ آپ بری قرار دیدیئے جائیں۔

(۴) اور اگر معاملہ جیل خانہ تک بھی جا پہنچے، تو وہاں بھی اس کا امکان ہے کہ چکی کی سزا آپ کو ملنے اور پیسے کوئی اور۔

غرضیکہ اس قسم کے نظام میں اس کا امکان ہے کہ مجرم سزا سے بچ جائے اور بے گناہ پکڑا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ نظام، کائنات کے نظامِ عدل سے مختلف اور بے حد ناقص ہے۔ لیکن قرآن ہمیں یہ بتاتا ہے

قانون مکافات

کہ انسانوں کے معاشرتی نظام عدل سے الگ، خود انسانوں کی دنیا میں بھی خدا کا کائناتی نظامِ عدل کارفرما ہے جو اُسی طرح، بغیر کسی سقم اور نقص کے، ہر عمل کا ٹھیک ٹھیک نتیجہ مرتب کرتا ہے جس طرح کائناتی نظام بلا رو رعایت، نتائج پیدا کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان جو کام ایسا کرتا ہے جس کا تعلق اس کی "انسانی زندگی" سے ہو، اس کا اثر اس کی ذات پر بھی مرتب ہوتا ہے۔ اسی کو اس عمل (کام) کا نتیجہ کہتے ہیں۔ مثلاً آگ میں اُنگلی ڈالنے کا تعلق، انسان کی طبیعی زندگی سے ہے۔ اس کا اثر خدا کے مقرر کردہ قانونِ طبیعی کے مطابق، انسان کی طبیعی زندگی پر پڑتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص کسی دوسرے کو آگ میں دھکیل دیتا ہے تو اس کے اس عمل کا تعلق اس کی انسانی زندگی سے ہے۔ جس کا اثر اس کی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ اگر وہ معاشرہ کے نظامِ عدل کی رُو سے، اس جرم کی سزا سے کسی طرح بچ بھی جائے تو بھی اس کا جو اثر اس کی ذات پر مرتب ہوتا ہے وہ اس کے نتیجے سے کسی صورت میں بھی بچ نہیں سکتا۔ اس کے لئے خدا کا نظامِ عدل کارفرما ہے جس میں نہ کسی گواہ کی ضرورت پڑتی ہے، نہ پولیس کی۔ نہ دنیاوی عدالت کی، نہ جیل خانے کی ـــــ پھر، چونکہ انسان کی ذات، اس کے جسم کی موت کے ساتھ فنا نہیں ہو جاتی، بلکہ آگے بھی چلتی ہے، اس لئے، انسان کا کوئی عمل بلا نتیجہ رہ نہیں سکتا۔ قرآن کریم نے اسے، کہیں "یَوْمِ الدِّیْنِ" کہہ کر پکارا ہے کہیں "یَوْمُ الْقِیٰمَۃِ" مطلب اس سے خدا کا نظامِ عدل ہی ہے۔ خواہ اس کے نتائج اس دنیا میں سامنے آجائیں یا مرنے کے بعد اگلی زندگی میں۔ اس نظامِ عدل کی خصوصیت کبریٰ قرآن نے ان چند الفاظ میں بیان کر دی ہے۔ وَاتَّقُوْا یَوْمًا

خدا کا نظامِ عدل

لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا وَّ لَا یُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّ لَا یُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ (۲/۴۸)۔ اس نظامِ عدل میں کوئی شخص کسی مجرم کا ذرا سا بوجھ بھی نہیں بٹا سکتا۔ ہر ایک کو اپنے کئے کی سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ نہ ہی کسی کی سفارش کسی کے کام آسکتی ہے۔ نہ ہی کوئی مجرم، اپنے جرم کے معاوضہ میں کچھ دے دلا کر چھوٹ سکتا ہے۔

اور نہ ہی کوئی شخص کسی مجرم کی کسی قسم کی مدد کر سکتا ہے۔ یہ ہے خدا کے نظامِ عدل کی بنیادی خصوصیت۔

اس مقام پر اس حقیقت کو پھر دہرا دیا جاتا ہے کہ قرآن کریم جب خدا کے نظامِ عدل کے متعلق گفتگو کرتا ہے تو اس سے مقصد محض اس نظام کا تذکرہ کرنا یا اس کی (DESCRIPTION) دینا نہیں ہوتا۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسانوں سے کہا جائے کہ تم غور کرو کہ خدا کا کائناتی نظام کس حسن و خوبی سے چل رہا ہے اور اس کے نتائج کس قدر خوشگوار مرتب ہوتے ہیں۔ اگر تم اپنے معاشرہ میں بھی اسی قسم کا نظام قائم کر لو تو اس کا نتیجہ بھی ایسا ہی خوشگوار مرتب ہوگا۔ یہ نظام ان قوانین کی رو سے قائم ہوگا جنہیں قرآن کریم میں بیان کیا گیا ہے۔

اس سے مقصد

مثلاً قرآن میں ہے کہ وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا (۱۱/۶)۔ "دنیا میں کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے سامانِ زیست کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو" یہ محض ایک واقعہ کا بیان نہیں۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ انسانوں کی دنیا میں بھی ایسا نظام قائم ہونا چاہیئے جس میں ہر متنفس کے سامانِ زندگی کے مہیا کرنے کی ذمہ داری، اس نظام پر ہو۔ اس نقطۂ نگاہ سے دیکھئے تو قرآن نے خدائی نظامِ عدل (یَوْمُ الدِّیْنِ یا یَوْمُ الْقِیٰمَةِ) کے متعلق جن تفاصیل کا ذکر کیا ہے ان سے یہ کہنا مقصود ہے کہ انسانی معاشرہ میں جو نظامِ عدل قائم ہو، اس کی خصوصیات بھی ایسی ہی ہونی چاہئیں۔ اس کے بعد تم دیکھو گے کہ یہ نظام بھی کس طرح اسی قسم کے نتائج پیدا کرتا ہے جس قسم کے نتائج، خدا کے نظامِ عدل سے مرتب ہوتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد آپ خدا کے نظامِ عدل کی موٹی موٹی خصوصیات ملاحظہ فرمائیے۔

نظامِ عدل کے قیام کے لئے، پہلی بنیادی شرط یہ ہے کہ اُس مملکت میں، اختیار و اقتدارِ اعلیٰ صرف ایک اتھارٹی کا ہو۔ اگر اس میں ایک سے زیادہ اربابِ اقتدار ہوں گے تو نظامِ عدل کبھی قائم نہیں ہو سکے گا۔

صرف ایک حاکمِ اعلیٰ

اس بنیادی نکتہ پر قرآن نے بڑا زور دیا ہے۔ سورۂ انفطار میں "یوم الدین" کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے۔

مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّیْنِ (۸۲/۱۸)

تمہیں معلوم ہے کہ یوم الدین کیا ہے؟ یہ بات تمہیں خدا کے سوا کوئی اور نہیں بتا سکتا۔

اس کے بعد ہے۔

يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا ۖ وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ (۸۲/۱۹)

جب کوئی فرد کسی دوسرے فرد کے لئے کوئی اختیار نہیں رکھے گا۔ اور حکم صرف ایک خدا کا چلے گا۔

سورۂ حج میں ہے۔ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ لِلّٰهِ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ (۲۲/۵۶)۔ جب اقتدار صرف خدا کا ہوگا۔ اور وہی لوگوں میں فیصلے کرے گا۔ اُس مملکت میں اقتدارِ اعلیٰ (SOVEREIGNTY) خدا کا ہوگا اور آخری فیصلہ کرنے کا اختیار (SUPREME AUTHORITY) اس کا ہوگا۔ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ (۴۰/۱۲)۔ حکم صرف خدا کا چلے گا جو بلند ترین غلبہ اور اقتدار کا مالک ہے۔ وہی اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ (۹۵/۸) ہے۔ اس نظام کی رو سے ارض و سماوات سب اس کے قبضۂ قدرت میں ہوں گے۔ وَ الْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ۔ وَ السَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ (۳۹/۶۷)۔

حق پر مبنی اقتدار

لیکن یہ اقتدار و اختیار ظلم اور دھاندلی سے حاصل کردہ نہیں ہوگا بلکہ سرتاپا حق و انصاف پر مبنی ہوگا۔ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ نِ الْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ (۲۵/۲۶)۔ اس میں خدائے رحمٰن کے لئے جو اقتدار و اختیار ہوگا وہ حق پر مبنی ہوگا۔

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا کہ نظامِ عدل کے قیام کے لئے ضروری ہے کہ

(۱) مملکت میں آخری اختیار صرف ایک مرکزی اتھارٹی کو حاصل ہو۔ اور

(۲) یہ اقتدار دھاندلی سے حاصل نہ کیا گیا ہو، بلکہ حق پر مبنی ہو۔ انسانوں کی دنیا میں حق کے معنی ہیں، وہ جو قانونِ خداوندی کی رُو سے جائز ہو۔

حکومت صرف قانون کی

لیکن یہ اختیار و اقتدار کسی شخص یا اشخاص کی جماعت کو اپنے طور پر حاصل نہیں ہوگا۔ یہ اختیار صرف قانون کو حاصل ہوگا۔ یعنی اس نظام میں فرمانروائی صرف قانون کی ہوگی، اور جسے اوپر مرکزی اتھارٹی کہا گیا ہے اس کا کام قانون کو نافذ کرنا ہوگا۔ اپنی مرضی چلانا نہیں۔ خارجی کائنات میں یہ قانون ہر شے کے اندر از خود موجود ہے۔ لیکن انسانوں کو یہ قانون وحی کے ذریعے دیا گیا ہے اور اب اپنی مکمل شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے۔ اس لئے انسانی نظامِ عدل میں خدا کی حکمرانی کے معنی ہوں گے اس کی کتاب کی حکمرانی۔ چنانچہ خدا نے بالتصریح کہہ دیا کہ وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)۔ جو خدا کی کتاب کے مطابق فیصلے نہیں کرتا تو یہ لوگ خدا کے قانون کے منکر ہیں۔

قانون سازی کا اختیار

انسانی نظامِ عدل کے جن استقام و نقائص کا شروع میں ذکر آچکا ہے، ان کے علاوہ، اس میں ایک بہت بڑی خرابی اور بھی ہے۔ اس میں خود قانون سازی کا اختیار کسی ایک انسان یا انسانوں کی جماعت کو حاصل ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے انبیاء

ہوتا ہے کہ جہاں وہ قانون ساز اتھارٹی دیکھتی ہے کہ کسی قانون سے اس کے مفاد پر زد پڑتی ہے، وہ اس قانون ہی کو بدل دیتی ہے۔ اس طرح خود قانون کے مطابق چلنے کی مدعی مملکت میں بھی عملاً لاقانونیت پھیل جاتی ہے۔ قانون کی کارفرمائی کا فائدہ اس صورت میں ہے جب ہر شخص کو معلوم ہو کہ فلاں بات کے لئے قانون کیا ہے اور اس کے ساتھ ہی اسے اس بات پر کلی اعتماد اور بھروسہ ہو کہ یہ قانون جب جی چاہے بدلا نہیں جائے گا۔ قانون پر اسی قسم کا یقینِ محکم اور اعتمادِ کامل ہی ہے جس سے انسان اطمینان کی زندگی بسر کر سکتا ہے۔ لہٰذا، انسانی نظامِ عدل اسی صورت میں اطمینان بخش ہو سکتا ہے جب اس کے قوانین غیر متبدل ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے قوانین کے متعلق جو قرآن میں مذکور ہیں، کہہ دیا کہ وَ تَمَّتْ

غیر متبدل قانون

كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا ۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (۶/۱۱۶)۔ "اور تیرے رب کا قانون صدق اور عدل کے ساتھ مکمل ہو گیا۔ اس کے قوانین میں کوئی تبدیلی کرنے والا نہیں"۔ یعنی اس کی طرف سے نازل کردہ ضابطۂ قوانین ہر اعتبار سے مکمل بھی ہے اور غیر متبدل بھی۔ انسانی نظامِ عدل، ان غیر متبدل قوانین کو اپنے اپنے حالات کے مطابق نافذ کرنے کے لئے، جزئی تفاصیل مرتب کر سکتا ہے۔ وہ ان اصولوں میں نہ حک و اضافہ کر سکتا ہے۔ نہ تغیر و تبدل۔ اس طرح، انسانی نظامِ عدل، خداوندی نظام سے ہم آہنگ ہو کر، اسی قسم کے غیر متبدل نتائج پیدا کر سکتا ہے۔

انسانی نظامِ عدل میں ایک سقم یہ بھی ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے خلاف جھوٹے دعوے دائر کر دیتے ہیں۔ حکومت کسی کے خلاف کوئی کارروائی کرتی ہے تو اس کی بنیاد اس کی اپنی مشینری کی رپورٹ پر ہوتی ہے جو غلط بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن خدا کے نظامِ عدل میں ایسا نہیں ہو سکتا۔

سچی فردِ جرم

اس میں مجرمین کے خلاف جو فردِ جرم مرتب کی جائے گی وہ ہر نوع سے مکمل بھی ہو گی اور بالکل صحیح اور درست بھی۔ سورۂ کہف میں ہے۔ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ ۔ اسے دیکھ کر ان کا رنگ فق ہو جائے گا۔ وَ يَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا ۔ مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّ لَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا ۔ اور وہ کہیں گے کہ ہماری بدبختی! یہ کس قسم کی فردِ جرم ہے جس میں کوئی چھوٹی بڑی بات درج ہونے سے رہ ہی نہیں گئی۔ اس نے ہمارے تمام اعمال کا احاطہ کر لیا ہے وَ وَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۔ اور وہ اس طرح اپنے تمام اعمال اپنے سامنے موجود پائیں گے۔ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا (۱۸/۴۹)۔ اس لئے کہ اللہ کسی پر ذرا بھی ظلم اور زیادتی نہیں کرتا۔ عدل کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ مجرم کے خلاف فردِ جرم ٹھیک ٹھیک مرتب ہو۔ اس میں کسی قسم کی غلطی یا زیادتی نہ ہو۔ مقدمہ کا فیصلہ تو بہت

بعد کی چیز ہے، فردِ جرم میں غلط بیانی یا زیادتی بجائے خویش ظلم ہے - فردِ جرم میں حق (سچ) کے سوا کچھ نہیں ہونا چاہیئے - چنانچہ خدا کے نظامِ عدل میں فردِ جرم کی یہی کیفیت ہو گی - اس میں مجرمین سے برملا کہہ دیا جائیگا کہ هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ - اس فردِ جرم میں تمہارے خلاف جو کچھ کہا گیا ہے وہ سرتاسر حق پر مبنی ہے إِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○ (۲۹/۴۵) - تم جو کچھ کرتے تھے، اسے ہم ساتھ کے ساتھ لکھ لیا کرتے تھے - یہ استغاثہ محض سُنی سنائی باتوں پر مبنی نہیں - تحریری ریکارڈ پر مبنی ہے - غالب کو شکایت تھی کہ

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا؟

یہ اس کی محض شوخیٔ طبع تھی انسانی نظامِ عدل پر رمز وکنایہ کے انداز میں سخت طنز و تنقید۔ نظامِ عدلِ خداوندی

خود ملزم کی مرتب کردہ فردِ جرم

میں، فردِ جرم، نہ فرشتوں کی مرتب کردہ ہوتی ہے نہ کسی اور انسان کی، یہ خود ملزم کی مرتب کردہ ہوتی ہے - وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ - ہر شخص کا اعمالنامہ اس کی گردن کے ساتھ لٹکا ہوا ہوتا ہے - وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا - فرق یہ ہے کہ ظہورِ نتائج سے پہلے، وہ اعمالنامہ لپٹا ہوا ہوتا ہے - ظہورِ نتائج کے وقت اسے کھول دیا جاتا ہے - اور ملزم سے کہا جاتا ہے کہ

اِقْرَاْ كِتٰبَكَ

تو اپنا اعمال نامہ خود ہی پڑھ لے - اپنی مرتب کردہ فردِ جرم، عدالت میں آپ پڑھ کر سُنا - اور اس کے بعد خود ہی فیصلہ کر کہ تیری سزا کیا ہونی چاہیئے - كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا (۱۷/۱۳-۱۴) - آج اپنے خلاف حساب کرنے کے لئے تو خود ہی کافی ہے - کسی اور حساب کرنے والے کی ضرورت ہی نہیں -

---

اپنے خلاف آپ گواہی

انسانی نظامِ عدل میں اگلا سقم یہ ہوتا ہے کہ مقدمہ میں ملزم کے خلاف جھوٹے گواہ پیش کر دیئے جاتے ہیں اور بے گناہ دھر لئے جاتے ہیں - خدائی نظامِ عدل میں یہ نہیں ہو سکتا - اس میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

جو چپ رہے گی زبانِ خنجر، لہو پکارے گا آستیں کا

اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ○ (۳۶/۶۵) - آج تمہیں زبان سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہو گی - تمہارے خلاف خود تمہارے

ہاتھ پاؤں گواہی دیں گے اور بتادیں گے کہ تم نے کیا کیا تھا۔ وہاں ہر مجرم خود اپنے خلاف آپ گواہی دیگا۔ وَ شَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ (۶/۱۳۰ ؛ ۲۴/۶)۔ اس طرح وہاں کوئی بات چھپی نہیں رہے گی۔ سب راز افشا ہو جائیں گے۔ يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ (۸۶/۹)۔

قرآن کا منشاء یہ ہے کہ اس قسم کا نظامِ عدل، انسان اپنے معاشرے میں رائج کرے۔ اس مقام پر یہ کہا جائے گا کہ یہ تو ہو سکتا ہے کہ یہ نظام ایسا انتظام کر لے کہ اس کی خبر رساں ایجنسیاں جھوٹی رپورٹ نہ کریں۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ملزم خود اپنے خلاف شہادت دے۔ لیکن قرآن ایسے ناممکن نہیں بتاتا۔ وہ کہتا ہے کہ اگر انسانوں کی صحیح تربیت کی جائے تو مجرم اپنے خلاف آپ بھی شہادت دے سکتا ہے۔ اسی لئے اس کا ارشاد ہے کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ۔ اے ایمان والو! تم دنیا میں نظامِ عدل قائم کرو۔ اور اس کے لئے جب کہیں شہادت کی ضرورت پڑے تو مدعی یا مدعا علیہ۔ ملزم یا مستغیث کی طرف سے گواہ بن کر نہ جاؤ بلکہ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ۔ صرف خدا کے لئے گواہی دو۔ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ۔ خواہ یہ گواہی خود تمہاری اپنی ذات کے خلاف ہی کیوں نہ جائے۔ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ۔ یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا خواہ ملزم غریب ہو یا امیر۔ اس سے تمہاری گواہی پر کچھ اثر نہیں پڑنا چاہیئے۔ فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا۔ تم سچائی سے ہٹ کر ان کے خیر خواہ بننے کی کوشش نہ کرو۔ تم سے زیادہ خدا ان کا خیر خواہ ہے۔ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى۔ دیکھنا اس باب میں کہیں جذبات تم پر غالب نہ آجائیں۔ ایسا بھی نہ کرنا کہ کوئی ذومعنی یا پیچ بات کر کے اصل حقیقت کو چھپا لو۔ وَ اِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا (۴/۱۳۵)۔ یا شہادت دینے سے اعراض برتو۔ یاد رکھو! خدا تمہارے ہر عمل سے باخبر ہے۔ اس لئے تم دنیا والوں سے تو بات چھپا سکتے ہو۔ خدا سے نہیں چھپا سکتے۔ یہی وہ ایمان ہے جس سے انسان کی ایسی تربیت ہو جاتی ہے کہ وہ سچی سچی شہادت دے، خواہ وہ اس کے اپنے خلاف ہی کیوں نہ جائے۔

وکیل کی ضرورت نہیں

ظاہر ہے کہ اس قسم کے نظام میں، جس میں ہر بات ٹھیک ٹھیک سامنے آجائے حتیٰ کہ مجرم خود اپنے خلاف آپ گواہی دیدے۔ کسی وکیل کی ضرورت ہی نہ ہوگی۔ وکیل کی ضرورت تو غلط نظامِ عدل میں پڑتی ہے۔ نظامِ خداوندی میں اس کے لئے کوئی گنجائش ہی نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے اس نے اس قسم کے وکیلوں سے کہا کہ تم دنیاوی نظام میں تو مجرمین کی طرف سے جھگڑنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہو، لیکن فَمَنْ يُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَمْ مَّنْ يَّكُوْنُ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا (۴/۱۰۹)۔ خدا کے نظامِ عدل میں، فیصلے کے وقت

مجرمین کی طرف سے اللہ سے جھگڑنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ نہ ہی کوئی ان کا وکیل بن سکے گا۔

اب اس کے بعد اگلا مرحلہ آتا ہے جس میں عدالت کو کسی طرح متاثر کر دیا جاتا ہے کہ وہ مجرم کے حق میں فیصلہ دیدے۔ خدا کے نظامِ عدل میں ایسا ہونا ناممکن ہے۔ وہاں نہ کسی کی سفارش چل سکتی ہے نہ رشوت۔ نہ ہی کوئی فدیہ دے کر چھوٹ سکتا ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے، اس سلسلہ میں قرآن کریم میں ہے۔ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا۔ اس دن کو ہمیشہ نگاہ میں رکھو اور اپنے بچاؤ کی شکل پیدا کر لو

نہ سفارش نہ رشوت

جب کوئی شخص کسی دوسرے کے کام نہیں آسکے گا۔ وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ نہ ہی کسی کی سفارش قبول کی جائے گی وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ نہ کوئی معاوضہ دے کر چھوٹ سکے گا۔ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ (۲/۴۸)۔ نہ کوئی شخص مجرم کا حامی و مددگار ہوگا۔ دوسری جگہ ہے يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ (۲/۲۵۴)۔ جس دن نہ انصاف بک سکے گا۔ نہ کسی کی دوستی یا سفارش کام آسکے گی۔ نہ باپ بیٹے کے کام آسکے گا نہ بیٹا باپ کے (يَوْمًا لَّا يَجْزِيْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ وَلَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَيْئًا (۳۱/۳۳)۔ اس دن نہ کسی کی دولت اس کے کام آسکے گی۔ نہ اولاد۔ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ (۲۶/۸۸) غرضیکہ اس نظام میں اصول یہ ہوگا کہ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (۶/۱۶۱)۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکے گا۔ جس نے کوئی اچھا کام کیا ہوگا اس کا فائدہ اسی کو ہوگا۔ جس نے جرم کیا ہوگا اس کی سزا بھی وہ خود بھگتے گا۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (۲/۲۸۶)۔ اور اس قانون میں نہ کوئی استثنا ہوگی نہ کسی کی رعایت۔ حتیٰ کہ اگر (بفرضِ محال) خدا کا رسول بھی، قانون خداوندی کی خلاف ورزی کرے تو اسے بھی معاف نہیں کیا جائے گا۔ سورۂ زمر میں رسول اللہؐ سے کہا گیا ہے کہ قُلْ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (۳۹/۱۳)۔ تم اس کا اعلان کر دو کہ

رسول کی بھی رعایت نہیں ہوگی

اگر میں بھی اپنے رب کی نافرمانی کروں تو میں یومِ مکافات سے ڈرتا ہوں۔ اس دن کا عذاب بڑا سخت ہوگا۔ اور اس میں میری بھی کوئی رعایت نہیں کی جائے گی۔

نظامِ عدل کو ہونا ہی ایسا چاہیے جس میں بڑے اور چھوٹے کی کوئی تمیز نہ ہو۔ نہ کسی کے ساتھ رعایت کی جائے۔ نہ کسی سے زیادتی۔

اس نظامِ عدل کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر شخص کو اس کے کیے کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا۔ کسی سے کوئی ظلم اور زیادتی نہیں ہوگی۔ واضح رہے کہ یہ نظامِ عدل صرف جرائم کی سزا دہی تک محدود نہیں ہوگا۔ انسان کے ہر اچھے

پورا پورا بدلہ

یا برے عمل کا صحیح صحیح نتیجہ مرتب کرنے کے لئے قائم کیا جائے گا۔ وَ نَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ۔ اس دن عدل کا ترازو کھڑا کیا جائے گا فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا ؕ اور کسی شخص پر کسی قسم کا ظلم اور زیادتی نہیں ہوگی۔ وَ اِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ؕ اگر کسی کا کوئی عمل رائی کے دانے کے برابر بھی ہوگا تو ہم اسے اس کے سامنے لے آئیں گے۔ وَ كَفٰى بِنَا حَاسِبِيْنَ (۲۱/۴۷)۔ اور ہم حساب کرنے کے لئے کافی ہیں۔ دوسرے مقام پر ہے۔ اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ (۴۰/۱۷)۔ اس دن ہر متنفس کو اس کے عمل کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا۔ اور کسی کے خلاف کوئی ظلم اور ناانصافی کی بات نہیں ہوگی۔ یہ قرآن کریم کے ایک دو نہیں سینکڑوں مقامات میں مختلف انداز میں مذکور ہے (مثلاً ۱۶/۱۱۱ ؛ ۳۹/۷۰ وغیرہ) قرآن کی پوری تعلیم اسی مرکز کے گرد گردش کرتی ہے۔ یہی اس کے پیغام کا نقطۂ ماسکہ ہے۔ یہی وہ بنیادی اینٹ ہے جس پر اس کے نظام کی ساری عمارت استوار ہے۔ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَ مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝ (۹۹/۷-۸) جس کے نامۂ اعمال میں، ذرّہ برابر بھی کوئی عمل خیر ہوگا، وہ اس کا نتیجہ بھی اپنے سامنے دیکھ لے گا، اور جس نے ایک ذرّہ برابر کوئی خراب کام کیا ہوگا، اس کا نتیجہ بھی اس کے سامنے آجائے گا۔ اور پھر اس کا مقام متعین کرنے کے لئے، ان دونوں پلڑوں کا موازنہ کیا جائے گا۔ فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ۔ جس کا تعمیری کاموں کا پلڑا جھکا ہوگا وہ کامیابی و کامرانی کی زندگی بسر کرے گا۔ وَ اَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ۔ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۝ (۱۰۱/۶-۹)۔ اور جس کا وہ پلڑا ہلکا ہوگا، وہ تباہیوں کے جہنم میں جائے گا۔ یہ ہے وہ صحیح معیارِ عدل، جس کے مطابق نظامِ خداوندی میں افراد کے مقامات کا تعین ہوگا۔ قرآن کا منشاء یہ ہے کہ یہی معیار، انسانوں کے نظامِ معاشرہ میں بھی مقرر کیا جائے۔ نہ کسی کا کوئی (MERIT) بلا معاوضہ (UN - REWARDED) رہ جائے، نہ کوئی مجرم، اپنے کئے کی سزا بھگتنے سے بچ سکے۔ اور یہ کچھ اس طرح کھلے اور نکھرے طور پر ہو کہ معاشرہ میں شریف اور بدمعاش، چھٹ کے الگ الگ ہو جائیں تاکہ کوئی شخص، کسی کے متعلق دھوکے میں نہ رہے۔

مجرم الگ ہو جائیں

خدا کے نظامِ عدل میں یہی صورت ہوتی ہے۔ وہاں عملاً یہ شکل سامنے آجاتی ہے کہ وَ امْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ (۳۶/۵۹)۔ مجرم، باقی معاشرہ سے الگ ہو جاتے ہیں۔ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ۔ وہ اپنی علامات سے پہچانے جاتے ہیں۔ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَ الْاَقْدَامِ (۵۵/۴۱)۔ اور جھٹ قانون کی گرفت میں آجاتے ہیں ایسے نظامِ عدل میں معاشرہ کو نہ انہیں پہچاننے میں کوئی دقت ہوگی۔ نہ گرفتار کرنے میں کوئی دشواری۔ اس میں مجرم کو کہیں پناہ نہیں مل سکے گی۔ ہر شریف آدمی دُور سے پکار اٹھے گا کہ لَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ (۲۸/۱۷)

میں کبھی مجرموں کی پشت پناہ نہیں بن سکتا۔ اس طرح، زمین اپنی وسعتوں کے باوجود ان پر تنگ آجائے گی۔ حَتّٰٓى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ (۹/۱۱۸)، بلکہ وہ خود اپنی جان سے تنگ آجائیں گے۔ وَ ضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ (۹/۱۱۸)۔ اور یوں، وہ خود، اپنے جرم کی سزا پانے کے لئے حاضرِ عدالت ہو جائیں گے، اس لئے کہ انہیں یقین ہو جائے گا کہ اس (عدالت) کے سوا انہیں کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔ وَ ظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ (۹/۱۱۸)۔ اب یہ عدالت کے دیکھنے کی چیز ہوگی کہ جرم کی نوعیت اور مجرم کی نفسیاتی کیفیت کیا ہے۔ اگر وہ سہو و خطا کا نتیجہ ہے اور عمداً اور عادۃً سرزد نہیں ہوا۔ اور مجرم اپنی لغزش پر نادم ہے اور اس میں آئندہ کے لئے اصلاحِ حال کا امکان۔ تو وہ اسے معاف بھی کر دے گی۔ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ (۹/۱۱۸)۔ خدا کے نظامِ عدل میں، ایسے حالات میں توبہ اور عفو کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ نظامِ خداوندی میں توبہ اور عفو سے مراد یہ ہے کہ مجرم، اس کے بعد، اس قدر تقویت بخش، صلاحیت آمیز، تعمیری کام کرے کہ خلاف ورزیٔ قانون سے جس قدر نقصان، کسی دوسرے فرد، یا معاشرہ، یا خود اس کی اپنی ذات کا ہوا ہے اس کی تلافی بھی ہو جائے اور آئندہ کے لئے ایسے اقدام سے رک جانے کی قدرت بھی۔ اسی کو مغفرت کہتے ہیں۔ اگر کسی پودے کو کیڑا لگ جائے تو اس کی نشوونما رک جاتی ہے۔ لیکن اگر اسے سامانِ پرورش زیادہ بہم پہنچا دیا جائے اور کیڑوں سے اس کی رکھوالی کر لی جائے، تو اس سے وہ کمی بھی پوری ہو جاتی ہے جو اس کی نشوونما میں واقع ہو گئی تھی، اور اس کے بعد وہ مزید نشوونما بھی حاصل کر لے گا۔ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (۱۱/۱۱۴)۔ سے یہی مراد ہے۔ یعنی حسن و توانائی پیدا کرنے والے کام، خرابیاں پیدا کرنے والے کاموں کے مضر اثرات کو زائل کر دیتے ہیں۔ انسانی نظامِ عدل میں، اس طرح کا انتظام ہونا بھی نہایت ضروری ہے۔

معافی کی گنجائش

یہ ہے خدا کے نظامِ عدل کا وہ نقشہ جسے قرآن نے اس لئے پیش کیا ہے کہ انسان، اپنے معاشرہ میں بھی اسی انداز کا نظامِ عدل قائم کرے۔ سوچئے کہ جس معاشرہ میں ایسا نظامِ عدل قائم ہو جائے اس میں قانون کے مطابق چلنے والوں کی زندگی کیسی جنت در آغوش ہو جائے گی۔ یہی قرآن کا مقصود ہے۔

یہ ہے خدا کا وہ تصور جسے قرآن نے پیش کیا ہے۔ یعنی وہ خدا جس کا ہر کام قاعدے اور قانون کے مطابق ہوتا ہے اور جس کا نظام یکسر عدل پر مبنی ہے۔

رحم کا تصوّر

کہا جا سکتا ہے کہ قرآن میں عدل کے ساتھ رحم بھی تو ہے (کیونکہ خدا رحیم ہے) قانون کے ساتھ رحم کا جوڑ کس طرح ہو سکتا ہے؟ قرآن کی رو سے، عدل کے ساتھ رحمت ہے۔

رحم نہیں۔ اور ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ رحم ایک جذباتی چیز ہے جو کسی پر ترس کھا کر ظہور میں آتی ہے۔ اس کا واقعی قانون اور عدل سے کوئی تعلق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عیسائیت نے جب نجات کا مدار رحم پر رکھا تو اسے قانون اور عدل کے تصور سے یکسر دامن کش ہونا پڑا۔ عیسائیت میں رحم کے معنی یہ ہیں کہ جب خدا نے دیکھا کہ ہر انسان پیدائشی طور پر گنہگار پیدا ہوتا ہے اور اس کی یہ آلودگی، اعمال کے ذریعے کسی صورت میں بھی رفع نہیں ہو سکتی، تو اسے اپنے بندوں پر رحم آیا۔ اس کے لئے اس نے اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی دی تاکہ وہ انسانوں کے گناہوں کا کفارہ بن جائے اور ان کی نجات ہو جائے۔

رحم اور رحمت میں فرق

رحمت کا تصور اس سے مختلف ہے اور وہ قانون ہی کا ایک گوشہ ہے۔ آپ پہلی مثال کو پھر سے سامنے لائیے۔ آپ نے آگ میں انگلی ڈال دی اور وہ جل گئی۔ اس سے آپ کو سخت تکلیف پہنچ رہی ہے۔ لیکن جس خدا نے آگ میں یہ تاثیر رکھی ہے، اس نے ایسی دوائیاں بھی پیدا کر دی ہیں جن سے جلن کی تکلیف دور ہو جاتی ہے اور زخم بھی مندمل ہو جاتا ہے، اگر آپ ان دوائیوں کی طرف رجوع کریں گے تو آپ کی تکلیف رفع ہو جائے گی۔ یہ رحمت خدا کے اسی قانون ہی کی طرف ہے جو ہر ایک کے لئے عام ہے۔ یعنی جو شخص بھی اس قانون خداوندی کی طرف رجوع کریگا اس سے نفع یاب ہو جائے گا۔ آگ کے ساتھ اس قسم کی دوائیوں کا پیدا کر دینا، خدا کی رحمت ہے۔ رحمت کے معنی ہیں نرمی اور رافت سے سامانِ نشو و نما بہم پہنچانا۔ یہ رحم کا وہ جذبہ نہیں جو کسی پر ترس کھانے سے پیدا ہوتا ہے۔ خدا، انسانی جذبات سے بلند اور منزّہ ہے۔

اسلامی مملکت

یہ تھا خدا کا وہ تصور جسے قرآن کریم نے پیش کیا۔ اس خدا پر ایمان رکھنے والی قوم نے ایک مملکت قائم کی جس کے اولیں سربراہ خود نبی اکرمؐ تھے۔ حضورؐ نے اس مملکت کا جو منشور جاری فرمایا اس کے سرفہرست یہ انقلاب آفریں اعلان تھا کہ

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝ (۳/۷۹)۔

کسی انسان کے لئے یہ جائز نہیں کہ خدا اسے ضابطہ قوانین۔ حکومت، حتیٰ کہ نبوت تک بھی دیدے اور وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم قانونِ خداوندی کی نہیں بلکہ میری محکومی اختیار کرو۔ اسے صرف یہ کہنا چاہیئے کہ تم سب اللہ کے اس ضابطہ قوانین کی رُو سے

ربانی بن جاؤ جیسے تم پڑھتے پڑھاتے ہو اور جس کی تعلیم کو تم اپنے دلوں پر نقش کرتے رہو۔

آپ نے غور فرمایا کہ یہ عظیم اعلان کس طرح دنیا میں قانون کی حکومت قائم کرنے کا دستور اساسی بنتا ہے۔ اس کے بعد خود نبی اکرمؐ سے کہہ دیا گیا کہ لوگ تمہارے پاس اپنے متنازعہ فیہ معاملات لے کر آئیں گے فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ (۵/۴۸)۔ ان میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کیا کرو۔ رسول اللہؐ کو اس ضابطۂ قوانین میں رد و بدل کرنے کا کوئی اختیار نہیں تھا۔ "حزبِ مخالف" کی طرف سے یہ مطالبہ پیش ہوتا تھا کہ اس ضابطہ قوانین کی جگہ دوسرا ضابطہ لے آؤ۔ اَوْ بَدِّلْهُ۔ یا اس میں کچھ تغیر و تبدل کر دو۔ تاکہ باہمی مفاہمت کی شکل پیدا ہو سکے۔ آپ کی طرف سے اس کا جواب یہ دیا جاتا تھا کہ مَا يَكُونُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ (۱۰/۱۵)، یہ بات میرے حیطۂ اختیار سے باہر ہے کہ میں اس ضابطہ قوانین میں اپنی طرف سے کچھ رد و بدل کر دوں۔ میرا فریضہ تو اس کا اتباع کرنا ہے۔ نہ کہ اس میں رد و بدل کرنا۔ رد و بدل کرنا تو ایک طرف اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (۶/۱۵)۔ اگر میں بھی اس کے کسی قانون کی خلاف ورزی کروں، تو مجھے بھی اس کی سزا ملے گی۔

واضح رہے کہ یہ جو اوپر کہا گیا ہے کہ "حزبِ مخالف" کی طرف سے اس قسم کا مطالبہ پیش ہوتا تھا تو اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ اسلامی مملکت کی پارلیمان میں ایک حزبِ اقتدار (RULING PARTY) ہوتی تھی اور دوسری حزبِ مخالف (OPPOSITION) قطعاً نہیں۔ اسلامی مملکت میں ساری امت ایک جماعت (پارٹی) ہوتی ہے۔ امت کے اندر پارٹیوں کے وجود کا تصور غیر قرآنی اور حکمتِ فرعونی پر مبنی ہے۔ قرآن کی رو سے دنیا میں دو ہی پارٹیاں ہیں۔ ایک امتِ مسلمہ اور دوسرے تمام غیر مسلم۔ یعنی نظامِ خداوندی کی مخالف جماعتیں۔ اسی کو ہم نے "حزبِ مخالف" کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی محمد رسول اللہ کی پارٹی کے مقابلہ میں ابوجہل اور ابولہب کی پارٹی۔ یہ مطالبہ انہی کی طرف سے تھا۔

اب آگے بڑھئے۔ اس مملکت میں، قانون کی اطاعت اور شخصیتوں کی اطاعت کا فرق کس قدر بین اور واضح تھا، اس کے لئے سینکڑوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ لیکن میں صرف ایک واقعہ پر اکتفا کروں گا جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے بڑا معمولی سا ہے۔ .. ..

قانون اور شخصیت کی اطاعت میں فرق

.. لیکن نتیجہ کے اعتبار سے بڑا اہم اور دور رس۔ مدینہ میں ایک لونڈی تھی بریرہ نامی۔ وہ اپنے مالک سے ناراض ہو کر الگ ہو گئی۔ اس شخص کے کہنے پر آپؐ نے بریرہ سے کہا کہ تم اس کے پاس چلی جاؤ۔ ذرا فریقین کی پوزیشن کو سامنے رکھئے۔ کہنے والے ہیں محمد رسول اللہ۔

اسلامی مملکت کے واحد فرمانروا۔ مدینہ کے حاکم۔ اور کہا جا رہا ہے ایک لونڈی سے۔ کیا اس لونڈی کی جرأت ہو سکتی تھی کہ سامنے سے لب کشائی کر سکے۔ لیکن وہاں تو تربیت ہی ایسی دی گئی تھی کہ لونڈیاں تک قانون اور شخصیت میں فرق کرنا سمجھ گئی تھیں۔ بریرہ نے کہا کہ حضورؐ! آپ کا یہ حکم وحی کی رو سے ہے یا اپنا ذاتی ارشاد ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ یہ میری اپنی سفارش ہے۔ اس پر بریرہ نے کہا کہ پھر آپ معاف فرمائیے۔ میں اپنے معاملات کو خود بہتر سمجھتی ہوں — اور آپ تبسم فشاں تشریف لے گئے۔

اور یہی تھے وہ رسولؐ جنہوں نے اپنی حیات ارضی کے آخری لمحہ میں واضح الفاظ میں ارشاد فرمادیا کہ

اے پیغمبر کی بیٹی فاطمہؓ اور اے پیغمبر کی پھوپی صفیہؓ! خدا کے ہاں کے لئے کچھ کر لو۔
میں تمہیں خدا سے نہیں بچا سکتا۔

اس لئے کہ قانون کی کارفرمائی میں کسی کی سفارش کا کیا دخل؟

خلافتِ راشدہ

حکومت کے اس نہج کو حضورؐ کے سچے جانشینوں (رضی اللہ عنہم) نے بھی برقرار رکھا اس لئے کہ وہ بھی اُسی خدا پر ایمان رکھتے تھے جس نے قانون کا احترام سکھایا تھا۔ ان کی کیفیت یہ تھی کہ مملکت کے سربراہ ہوتے ہوئے یہ خود عدالتوں میں مدعا علیہ کی حیثیت سے پیش ہوتے تھے اور اگر کبھی ایسا نظر آتا کہ جج نے انہیں مدعی کے برابر نہیں رکھا بلکہ کچھ تعظیم کی ہے تو درخواست دے کر مقدمہ کسی اور عدالت میں منتقل کر لیتے کہ جو جج فریقین میں ذرا سا امتیاز بھی ملحوظ رکھتا ہے، ہو سکتا ہے کہ اس سے فیصلہ میں بھی کچھ رعایت ہو جائے۔ قانون کے دائرے سے نہ یہ خود باہر تھے نہ ان کے بیوی بچے۔ اگر انہیں دوائی کے لئے شہد کی ضرورت پڑتی اور شہد بیت المال میں موجود ہوتا تو اس کے لئے کیبنٹ کی منظوری حاصل کرتے۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ کا بیٹا مملکت کی چراگاہ میں اپنا اونٹ چراتا رہا جس سے وہ اونٹ فربہ ہو گیا اور اس نے اسے منافع پر بیچ دیا۔ باپ کو علم ہوا تو انہوں نے بیٹے کو ڈانٹا اور کہا کہ تمام زر منافع بیت المال میں داخل کرو۔ تم نے مملکت کی چراگاہ میں اپنا اونٹ کس کی اجازت سے چرایا؟ اور آپ کو معلوم ہے کہ آپ نے اپنے دوسرے بیٹے (عبد الرحمن) پر ایک جرم کی پاداش پر حد لگائی حالانکہ وہ سخت بیمار اور نحیف و زار تھے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ وہ اسی حالت میں مر گئے۔ ایک دفعہ مصر کے گورنر حضرت عمرو بن عاصؓ کے بیٹے محمد نے ایک مصری کے تازیانے مارے۔ وہ تازیانے مارتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ "میں بڑوں کی اولاد ہوں۔ اس لئے تمہیں تازیانے لگا سکتا ہوں"۔ جب اس کی شکایت حضرت عمرؓ کے کانوں تک پہنچی تو آپ نے حضرت عمرو بن عاصؓ اور ان کے بیٹے کو طلب کر لیا اور اس مصری کے ہاتھ میں تازیانہ دے کر کہا کہ "لے! اور بڑوں کی اولاد کو مار" تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ قانون کی نگاہ میں بڑے اور چھوٹے کا کوئی امتیاز نہیں۔ جب وہ اُسے جی بھر کر تازیانے

لگا چکا تو آپ نے اس سے کہا کہ اس کے باپ (یعنی مصر کے گورنر) کے سر پر بھی دو چار لگاؤ۔ اس لئے کہ اس کا بیٹا تمہیں کبھی نہ مارتا جب تک اسے باپ کی گورنری کا گھمنڈ نہ ہوتا۔ آپ نے حضرت عمرو بن عاصؓ کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ "عمرو! تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنانا شروع کیا ہے۔ ان کی ماؤں نے تو انہیں آزاد جنا تھا"

یہ تو رہی قانون کی پابندی۔ وہاں کیفیت یہ تھی کہ جو بات یونہی طے پا جاتی، اس کی پابندی بھی کس محنت سے کی جاتی تھی اس کے لئے اس واقعہ کو سامنے لائیے کہ جب آپ شام کے سفر کے لئے گئے ہیں تو سواری کا ایک اونٹ تھا اور طے یہ پایا تھا کہ آپ اور آپ کے ملازم اس پر باری باری سوار ہوں۔ جب منزل ختم ہوئی اور عیسائی حکومت کے نمائندے استقبال کے لئے آئے تو حالت یہ تھی کہ ملازم اونٹ پر سوار تھا اور خلیفۃ المسلمین مہار تھامے آگے آگے چل رہے تھے۔ اس لئے کہ اُس وقت سوار ہونے کی باری ملازم کی تھی ـــــ یہ سب کیا تھا؟ اُس خدا پر ایمان کا کرشمہ جس نے کہہ دیا تھا کہ وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا۔ تم خدا کی روش میں کبھی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔ اور لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ۔ اس کے قوانین میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔

مسلمانوں میں شخصی حکومت

اس کے بعد بدقسمتی سے مسلمانوں میں شخصی حکومت آگئی تو قانون کا تصور ہی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ شخصی حکومت کے معنی ہی یہ ہیں کہ اس میں قاعدہ اور قانون کوئی نہیں ہوتا۔ سب کچھ فرمانروا کی مرضی پر موقوف ہوتا ہے۔ سعدی کے الفاظ میں، بادشاہوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ۔ گاہے بسلامے برنجند دگاہے بہ دشنامے خلعت بہ بخشند۔ کبھی کسی کے سلام کرنے پر مزاج کا پارہ چڑھ گیا تو اسے اور اس کے بال بچوں کو کوٹھوں میں پلوا دیا۔ اور کبھی کسی کے گالی دینے پر خوش ہو گئے تو گاؤں جاگیر میں بخش دیا۔ پھر ان کے دربار میں یہ کیفیت ہوتی کہ دور دور تک حاجب و دربان پھیلے ہوتے اور کسی فریادی کو ان تک براہ راست پہنچنے کا یارا نہ ہوتا۔ اس کے بعد مقربین بارگاہِ عالیہ کا ایک گروہ ہوتا جنہیں بادشاہ سلامت کے مزاج میں بڑا دخل ہوتا۔ وہ مجرم کی سفارش کرتے تو پھانسی کا رسہ اس کی گردن سے نکال دیا جاتا۔ کسی بے گناہ کے خلاف ہو جاتے تو اسے حوالۂ دار و رسن کر دیا جاتا۔ بادشاہ کے دربار میں قصیدے پڑھے جاتے۔ اس کے حضور نذرانے پیش کئے جاتے۔ مقصد اس تمام کاروبار سے بادشاہ سلامت کی خوشنودی حاصل کرنا ہوتا۔

خدا کا بگڑا ہوا تصوّر

جب زمین پر اس قسم کے حاکم مطلق کی فرمانروائی تسلیم کر لی گئی تو آسمان پر خدا کا تصور بھی اسی قسم کا قائم کر لیا گیا۔ اس لئے کہ ان کے ہاں یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ السلطان ظل اللہ علی الارض بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہوتا ہے۔ جس قسم کا زمین پر سایہ، اسی قسم کا عرش پر اصلی بادشاہ۔ نہ یہاں کسی قاعدے اور قانون کی پابندی نہ وہاں

کسی آئین و دستور کا التزام - یہاں بھی ہر بات فرمانروا کی مرضی پر موقوف، وہاں بھی ہر فیصلہ خدا کی مرضی کے ماتحت یہ مرضی یہاں لحظہ لحظہ بدلتی رہتی ہے، وہ مرضی وہاں لمحہ بہ لمحہ تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ یہاں بھی کامیابی کے لئے بادشاہ کی خوشنودی مطلوب، وہاں بھی حصولِ مقصد کے لئے خدا کی خوشنودی درکار۔ اور خوشنودی کے حصول کا طریقہ - جذباتی اپیل - اس کے بعد دیکھئے کہ جس قسم کا بادشاہ کے دربار کا نقشہ یہاں سامنے آتا ہے اسی قسم کا تصور بارگاہِ خداوندی کا ذہنوں میں منقوش ہے۔ جب بھی کسی پر کوئی مصیبت پڑتی ہے تو وہ یہ دیکھنے

دربار خداوندی کا نقشہ

کے بجائے کہ میں نے خدا کے کس قانون کی خلاف ورزی کی ہے جس کا نتیجہ یہ نقصان ہے، کسی حضرت صاحب کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے تاکہ اُن کی وساطت سے خدا تک اپنی فریاد پہنچائے۔ حضرت صاحب کے حضور درخواست پیش کی جاتی ہے - وہ پوچھتے ہیں کہ اگر تمہارا کام بن گیا تو خدا کے نام پر کیا دو گے۔ جب سودا طے ہو جاتا ہے، تو حضرت صاحب، رات کو خدا کی بارگاہ میں پہنچ کر اس کی درخواست پر حکم لکھوا لاتے ہیں۔ چنانچہ آجکل یہ کاروبار اتنا عام ہو گیا ہے کہ ہر خلافِ قانون اقدام کے لئے جہاں افسرِ متعلقہ تک پہنچنے کی سفارش ڈھونڈی جاتی ہے، وہاں خدا تک سفارش پہنچانے کے لئے کسی زندہ یا مردہ حضرت صاحب کا سہارا تلاش کرنا پڑتا ہے۔ جہاں اُس افسر کو ہزار روپیہ رشوت کا دیا جاتا ہے وہاں، حضرت صاحب کے ارشاد کے مطابق، پانچ سو روپیہ کی خدا کی نیاز دی جاتی ہے۔ حضرت صاحب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے مزاروں اور خانقاہوں میں بجلی کے قمقمے لگوائے جاتے ہیں۔ خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے مسجدوں میں قالین بچھوائے جاتے ہیں۔ روپیہ دونوں جگہ ناجائز کمائی کا ہوتا ہے۔

قیامت میں عدل

قانون والے خدا نے، قیامت کا تصور ایسا دیا تھا جس میں نہ کسی کی سفارش چل سکے گی نہ فرمائش - نہ فدیہ دیکر چھٹکارا ہوگا نہ کفارہ دے کر۔ وہاں کامل قانون کی کارفرمائی ہوگی۔ لیکن جب خدا کے قانون کی جگہ لاقانونیت کا تصور عام ہو گیا تو قیامت کا نقشہ بھی بدل گیا۔ سینٹ پال نے کہا تھا کہ تم اعمال کے ذریعے نجات حاصل نہیں کر سکتے۔ ہمارے ہاں بھی اسی قسم کی روایات وضع کر لی گئی ہیں کہ لَنْ يَدْخُلَ اَحَدَكُمُ الْجَنَّةَ بِعَمَلِهٖ -

گنہگاروں کی بخشش

کوئی شخص اپنے اعمال کی رُو سے جنت میں نہیں جائے گا۔ جنت رسول اللہ کی شفاعت سے مل سکے گی۔ پھر حضورؐ کی شفاعت کے سلسلہ میں عجیب و غریب قسم کی روایات وضع کی گئیں۔ مثلاً مشکوٰۃ شریف میں (بخاری اور مسلم کے حوالے سے) یہ روایت درج ہے کہ قیامت میں جب گنہگار تمام انبیائے کرامؑ سے مایوس ہو جائیں گے تو رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔ حضورؐ ان سے فرمائیں گے کہ

میں شفاعت کا اہل ہوں (اور تمہاری سفارش کروں گا)۔ پھر میں خداوند تعالیٰ کے حضور میں حاضری کی اجازت طلب کروں گا خداوند تعالیٰ مجھ کو اجازت مرحمت فرمائے گا۔ اور میرے دل میں اپنی حمد وثنا کے الفاظ ڈالے گا کہ میں ان الفاظ سے خدا کی حمد وثنا کروں گا (وہ الفاظ اس وقت میرے ذہن میں نہیں ہیں) میں ان الفاظ سے خدا کی حمد وثنا کروں گا اور سجدہ میں گر پڑوں گا پھر مجھ سے کہا جائے گا۔ محمدؐ! اپنا سر اٹھا اور کہہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے میں سنوں گا۔ مانگ جو کچھ مانگنا چاہتا ہے دیا جائے گا۔ شفاعت کر تیری شفاعت قبول کی جائے گی۔ میں کہوں گا اے پروردگار! میری اُمّت کو بخش دے پروردگار! میری اُمّت کو بخش دے۔ خداوند تعالیٰ فرمائے گا جاؤ اور دوزخ سے ان لوگوں کو نکال لو جن کے دل میں جو برابر بھی ایمان ہو۔ میں جاؤں گا۔ اور پروردگار کے حکم کے مطابق عمل کروں گا۔ اور اس کے بعد درگاہ رب العزت میں دوبارہ حاضر ہوں گا اور خدا کی حمد وثنا انہی الفاظ میں کروں گا اور پھر سجدہ میں گر پڑوں گا کہا جائیگا۔ اے محمد! اپنا سر اٹھا۔ کہہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے سنا جائے گا۔ مانگ جو مانگنا چاہتا ہے دیا جائے گا۔ شفاعت کر تیری شفاعت قبول کی جائے گی۔ میں عرض کروں گا پروردگار، میں اپنی اُمّت کی شفاعت کرتا ہوں۔ میں اپنی اُمّت کی شفاعت کرتا ہوں۔ کہا جائے گا کہ جاؤ اور جس شخص کے دل میں ذرہ برابر یا رائی کی برابر بھی ایمان ہو اس کو دوزخ سے نکال لو۔ چنانچہ میں جاؤں گا اور خدا کے حکم کے مطابق عمل کروں گا اِس کے بعد پھر حضور رب العزت میں حاضری کی اجازت طلب کروں گا اور خدا کے حضور میں حاضر ہو کر انہیں الفاظ میں خدا کی حمد وثنا کروں گا اور پھر سجدہ میں گر پڑوں گا۔ کہا جائے گا محمدؐ! اپنا سر اٹھا اور کہہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے، سنا جائے گا۔ مانگ۔ جو مانگنا چاہتا ہے۔ دیا جائے گا۔ شفاعت کر تیری شفاعت قبول کی جائے گی۔ میں کہوں گا۔ پروردگار میری اُمّت۔ میری اُمّت (یعنی میری اُمّت کو بخش دے) کہا جائے گا جاؤ۔ اور جس شخص کے دل میں رائی کے چھوٹے سے چھوٹے دانہ کے برابر بھی ایمان ہو اس کو دوزخ سے نکال لو۔ میں جاؤں گا اور خدا کے حکم کے

مطابق عمل کروں گا۔ اس کے بعد چوتھی مرتبہ پھر درگاہ رب العزت میں حاضر ہوگا اور انہیں الفاظ میں حمد وثنا کروں گا پھر سجدہ میں گر پڑوں گا۔ کہا جائے گا محمدؐ! اپنا سر اٹھا کہہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے سُنا جائے گا۔ مانگ دیا جائے گا۔ شفاعت کر قبول کی جائے گی۔ میں عرض کروں گا۔ اے پروردگا، ان لوگوں کو دوزخ سے نکالنے کی اجازت مرحمت فرما جنہوں نے لا الٰہ الا اللہ کہا ہو (اور کوئی عمل نہ کیا ہو) خداوند تعالیٰ فرمائے گا۔ ان لوگوں کی سفارش تیرا حق نہیں ہے۔ قسم ہے اپنی عزت کی۔ اپنے جلال کی اور اپنی ذاتی اور صفاتی عظمت اور بزرگی کی میں ہی ان لوگوں کو دوزخ سے باہر نکالوں گا۔ جنہوں نے لا الٰہ الا اللہ۔ کہا ہوگا۔ (بخاری ومسلم)

(مشکوٰۃ اردو ترجمہ۔ جلد دوم۔ صفحہ ۳۱۵ — ۳۱۶)

اور یہ کچھ، برادرانِ عزیز! اس رسول کے متعلق کہا جارہا ہے جس نے (قرآن کی زبان میں) یہ اعلان کردیا تھا کہ اگر میں بھی قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کروں تو اس کی پاداشس سے بچ نہیں سکتا۔ غور کیجئے کہ جو شخص اپنے جرم وخطا کی پاداشس سے بھی نہیں بچ سکتا کیا وہ دوسرے مجرموں اور خطاکاروں کو اپنی سفارش سے، پاداشِ عمل سے بچا سکتا ہے؟

اسی طرح ایک اور روایت میں ہے کہ اس کے بعد خدا ان لوگوں کو بھی دوزخ سے نکال دے گا جنہوں نے کوئی بھلائی نہیں کی ہوگی ان کی گردنوں میں نشانیاں اور مہریں ہوں گی جن سے یہ ظاہر ہوگا کہ انہیں کسی نیک عمل کے سبب نہیں بخشا گیا۔ (مشکوٰۃ۔ جلد دوم صفحہ ۳۱۸)۔

ایک اور روایت

صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ دوزخ سے چار آدمیوں کو نکال دیا جائے گا اور خدا کے حضور پیش کیا جائے گا۔ اور انہیں دوبارہ دوزخ میں بھیج دیئے جانے کا حکم دیدیا جائے گا۔ ان میں سے ایک مڑکر دیکھے گا اور خدا سے عرض کرے گا۔ اے پروردگار! میں تو یہ امید رکھتا تھا کہ جب تو مجھے دوزخ سے نکال لے گا تو دوبارہ وہاں نہیں بھیجے گا۔ یہ کہہ کر رسول اللہؐ نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ اسے دوزخ سے نجات دیدے گا۔ (بحوالہ مشکوٰۃ۔ جلد دوم۔ صفحہ ۳۲۲)

یہ اُس خدا کا عمل بتایا جاتا ہے جس نے مسلمانوں سے کہا تھا کہ أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُم مَّثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلِكُم۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ تم یونہی جنت میں داخل ہوجاؤ حالانکہ تم ان جاں گداز مراحل سے نہیں گزرے جن سے اُمم سابقہ کو گزرنا پڑا تھا۔ مَّسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ

جنّت یونہی نہیں مل سکتی

وَالضَّرَّآءُ وَ زُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ- ان کی حالت یہ تھی کہ سختیاں اور مصیبتیں انہیں چاروں طرف سے گھیر لیتیں - ان کی شدت سے ان کے دل دہل جاتے - یہاں تک کہ وہ اور ان کا رسول پکار اٹھتے کہ بارالٰہا! تیرے قانون کے مطابق حق کی کامیابی کا وقت کب آئے گا- ..... ایسے ایسے ہمت شکن اور صبر آزما مراحل سے گزرنے کے بعد وہ جنت کے مستحق قرار پائے تھے - اسی طرح تمہیں بھی اپنے آپ کو جنّت کا مستحق بنانا پڑے گا - محض اتنا کہہ دینے سے کہ ہم ایمان لے آئے ہیں، تم چھوٹ نہیں سکو گے - اَمْ حَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَ هُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ (۲۹/۲)- جنت "بخشش" سے نہیں ملا کرتی - اسے خونِ جگر کی قیمت ادا کر کے خریدنا پڑتا ہے -

آں بہشتے کہ خدائے بتو بخشد ہمہ ہیچ
تا جزائے عملِ تست جناں چیزے ہست

قرآن کریم کی ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ اس قسم کی روایات، جن میں اعمال کے بغیر جنّت کی ضمانت دلائی گئی ہے کبھی رسول اللہؐ کی نہیں ہو سکتیں - یہ اس دور میں وضع کی گئی تھیں جب معاشرہ میں لاقانونیت پھیل چکی تھی اور مجرم سفارشوں سے چھوٹ جایا کرتے تھے یا بادشاہ سلامت کی من کی موج سے -

اولیاء کی طرف سے بخشش

یہ تو خیر پھر بھی خدا اور اس کے رسول کی باتیں تھیں، اپنے مریدوں کو جنت میں لے جانے کے متعلق مرشدانِ طریقت کے انداز اور بھی دل چسپ ہیں - حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے ملفوظات (دلیل العارفین) میں لکھا ہے کہ

> بروز قیامت - انبیاء - اولیاء سب قبروں سے اٹھائے جائیں گے - ان کے کندھوں پر کمبل پڑے ہوں گے - ہر ایک کمبل میں کم و بیش ایک لاکھ تاگے اور ایک لاکھ بانے کے ہوں گے - ان کے مرید اور بچے ان کے ان تاگوں کو پکڑ لیں گے اور اس وقت تک پکڑے رہیں گے جب تک خلق ہنگامۂ محشر سے فارغ نہ ہو - پھر حق تعالیٰ انہیں پل صراط پر پہنچائے گا اور وہ مع اپنے پیروں کے ان تین ہزار برس کے راستے کو ایک دم زدن میں، بہ برکت پکڑے رہنے اس گلیم کے طے کریں گے - اور دروازہ بہشت پر پہنچ کر (اس گلیم کے ساتھ چمٹے رہنے کی وجہ سے) دار النعیم میں داخل ہو جائیں گے -

آپ ان روایات اور حکایات کو دیکھئے اور پھر سوچئے کہ جس قوم میں اس قسم کے خیالات اور نظریات عام کر دیئے

جائیں اس قوم میں قانون کا کوئی احترام اور نیک کام کرنے کے لئے کوئی جذبہ باقی رہ سکتا ہے؟ جب حالت یہ ہو کہ ہر قسم کے مجرم، دھڑا دھڑ جنت میں داخل ہوتے چلے جائیں تو جرائم سے اجتناب کی ضرورت کسے لاحق ہو سکتی ہے۔ جرائم سے اجتناب تو ایک طرف ہمارے ہاں یہ روایت بھی موجود ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ

ضرور گناہ کرو

اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر تم ایسے ہو جاؤ کہ گناہ تم سے سرزد ہی نہ ہو تو خدا تمہیں زمین سے ہٹا دے اور تمہاری جگہ دوسرا گروہ پیدا کر دے جس کا شیوہ یہ ہو کہ گناہوں میں مبتلا ہو اور پھر خدا سے بخشش و مغفرت کی طلبگاری کرے۔

(مسلم۔ ترجمان القرآن۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۱۰۹)

یہ حدیث، مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) نے اپنی تفسیر، ترجمان القرآن میں درج کی ہے۔ اسے درج کرنے کے بعد وہ بڑے فخر سے لکھتے ہیں کہ "پس فی الحقیقت حضرت مسیح (علیہ السلام) کی تعلیم میں اور قرآن کی تعلیم میں اصلاً کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں کا معیار احکام ایک ہی ہے۔" حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ نہ وہ تعلیم حضرت مسیح علیہ السلام کی ہے اور نہ یہ قرآن کریم کی۔ وہ یہودی الاصل، سینٹ پال کی اختراع ہے اور یہ مجوسی الاصل جھوٹے راویوں کی سازش۔ عیسائیوں نے تو اس تباہ کن تعلیم سے اس طرح پیچھا چھڑا لیا کہ مذہب کو سیاست سے الگ کر کے، گناہ اور جرم میں فرق کر لیا۔ انہوں نے پادریوں سے

اس کا نتیجہ

کہہ دیا کہ وہ لوگوں سے ان کے گناہوں کا اقرار (CONFESSION) لے کر معافی نامے بیچتے رہیں۔ مجرموں کا معاملہ دنیاوی عدالت کی رو سے طے پائے گا جہاں قانون کی کارفرمائی ہوگی۔ لیکن سوچئے کہ جس قوم کا نظریۂ زندگی یہ ہو کہ مذہب اور سیاست الگ الگ ہیں۔ اور مذہب میں ان کا عقیدہ یہ ہو کہ اگر گناہ نہ کئے جائیں تو خدا انہیں مٹا کر ان کی جگہ دوسری قوم لے آئے گا، تو ان کی سیاست کا کیا رنگ ہوگا؟ وہی رنگ جسے ہم اپنے ہاں (اور ہر ملک کے مسلم معاشرہ میں) نکھرا اور ابھرا ہوا دیکھتے ہیں۔ یعنی اس میں لاقانونیت معاشرہ کی عام روش قرار پا جاتی ہے اور ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ اگر اس نے ایسے طریقے اختیار نہ کئے جو قانون کے خلاف جاتے ہوں تو اس کی جگہ کوئی دوسرا لے لیگا کیونکہ ان کے خدا نے (معاذ اللہ) کہہ رکھا ہے کہ اگر تم جرائم کا ارتکاب نہ کرو گے تو وہ تمہاری جگہ دوسروں کو لے آئے گا۔ آپ سوچئے کہ جس قوم کے یہ عقائد ہوں اور وہ ان عقائد میں ہزار سال سے ڈوبی چلی آ رہی ہو، اس میں قانون کا احترام اور اس کی پابندی کا جذبہ کسی طرح بھی پیدا ہو سکتا ہے؟ یہ چیزیں قوم کے تحت الشعور میں

جاگزیں ہو چکی ہیں اور جب تک یہ وہاں سے نہیں نکلیں گی، قوم میں قانون پر چلنے کی عادت پیدا ہو ہی نہیں سکے گی۔ ایک طرف آپ قوم سے کہتے ہیں کہ جرائم کا مرتکب ہونا بری بات ہے۔ دوسری طرف ان کا خدا (معاذ اللہ) ان سے یہ کہتا ہے کہ اگر تم جرائم کے مرتکب نہ ہوئے تو تمہیں مٹا دیا جائے گا۔ اور اس کے ساتھ ان کا رسول (پناہ بخدا) یہ جرأت دلا رہا ہے کہ تم جرائم سے مت گھبراؤ۔ میں تم سب کو، ایک ایک کر کے، دوزخ سے نکال کر جنت میں لے جاؤں گا۔ اور پیر صاحب یہ کہہ رہے ہیں کہ تم جو کچھ جی میں آئے کرتے جاؤ۔ بس تم میری گدڑی کے تاگے کے ساتھ چمٹ جانا۔ کیا مجال جو رضوان کو پتہ تک بھی لگ جائے کہ تم سمگل کر کے جنت میں پہنچائے جا رہے ہو۔۔۔ اس کے بعد فرمائیے کہ قوم آپ کے کہنے پر عمل کرے گی یا خدا اور رسول اور مرشدِ طریقت کی بات مانے گی؟

مغفرت اور شفاعت کا صحیح مفہوم

واضح رہے کہ "خدا کی بخشش" کے بجائے قرآن کریم کی صحیح اصطلاح "مغفرت" ہے جس کے معنی حفاظت کے ہیں۔ مطلب اس سے یہ ہے کہ اگر کسی شخص سے کوئی خطا ہو گئی ہے تو وہ اس سے توبہ کر کے اپنی روش میں تبدیلی کرے اور اس کے بعد ایسے اچھے کام کرے کہ ان کے خوشگوار نتائج سے اُس خطا کے نقصان رساں نتیجے سے حفاظت کا سامان مل جائے۔ إِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (۱۱/۱۱۵)۔ خدا کا ارشاد ہے۔ یعنی نیک کاموں کے خوشگوار نتائج سے، برے کاموں کے تباہ کن اثرات مٹ جاتے ہیں۔ یہ ہے مغفرت جو خدا کے قانون کی رُو سے حاصل ہوتی ہے۔

شفاعت کے معنی ہیں کسی کا کسی دوسرے کے ساتھ مل جانا اور اس طرح ایک سے دو ہو جانا، جیسے کسی فرد کا کسی جماعت کے ساتھ شامل ہو کر ان کے پروگرام کی تکمیل میں ان کا ساتھ دینا۔ دنیاوی امور میں شفاعت کے معنی ہوں گے کسی کے ساتھ تعاون کرنا۔ اس کی امداد کے لئے کھڑے ہو جانا۔ اور نظامِ عدل میں شفاعت کے معنی ہوں گے کسی کے حق میں سچی شہادت دینا۔۔۔ سفارش سے کسی مجرم کو چھڑوا دینے کا تصور قرآن کریم کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے۔ اس سے قرآن کے قانونِ مکافات کی ساری عمارت نیچے آگرتی ہے۔

باقی رہے ہمارے مرشدانِ طریقت اور ان کی گدڑیاں۔۔۔ تو یہ سب، علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں، اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودے ہیں۔ جب تک ان اجنبی تصورات کے پودوں کو اس زمین سے اکھاڑ کر باہر نہیں پھینکا جائے گا، اس میں اسلام کی فصل بار آور ہو ہی نہیں سکے گی۔

عزیزانِ من! قوموں کی زندگی پر ان کے معتقدات کا اثر بڑا گہرا ہوتا ہے۔ جب تک آپ ان غلط معتقدات کو

نہیں بدلتے، قوم کی حالت میں تبدیلی نہیں آسکتی۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ (۱۳/۱۱)۔ کا ارشادِ خداوندی اس کی محکم دلیل ہے۔ لیکن جب تک آپ میں مذہبی پیشوائیت موجود ہے آپ ان (غیر قرآنی) معتقدات کو بدل نہیں سکتے۔ انہوں نے خدا کی بخشش۔ رسول کی شفاعت اور مرشد کے وسیلہ کو، ایمان کے لاینفک اجزاء بنا رکھا ہے۔ اور احبار بھی ایسے کہ ان کے انکار کے تصور سے روح میں کپکپی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ سب اس لئے کہ گناہ بخشوالے، یا خدا سے اپنے جائز و ناجائز کام کرالے کے لئے جس قدر نذر نیاز دی جاتی ہے وہ سب مذہبی پیشواؤں کے حصے میں آتی ہے۔ قرآن کریم نے

مذہبی پیشوائیت

اس حقیقت کو بڑے دل چسپ انداز میں بیان کیا ہے وہ کہتا ہے کہ یہ لوگ کرتے ہیں کہ وَ جَعَلُوْا لِلّٰہِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَ الْاَنْعَامِ نَصِیْبًا۔ لوگوں کے مال مویشی اور کھیتی باڑی میں جو کچھ پیدا ہوتا ہے۔ مذہبی پیشوا اس میں سے ایک حصہ خدا کے نام کا الگ نکال لیتے ہیں۔ فَقَالُوْا ھٰذَا لِلّٰہِ بِزَعْمِھِمْ وَ ھٰذَا لِشُرَکَآئِنَا۔ اور کہتے ہیں کہ یہ، بزعمِ خویش، خدا کے لئے ہے اور دوسرا حصہ ان کے شرکاء کے لئے (جو اسے خدا تک پہنچا دیں گے) فَمَا کَانَ لِشُرَکَآئِھِمْ فَلَا یَصِلُ اِلَی اللّٰہِ۔ جو حصہ یہ اپنے شرکاء کے لئے الگ کر لیتے ہیں وہ تو خدا تک پہنچتا نہیں لیکن وَ مَا کَانَ لِلّٰہِ فَھُوَ یَصِلُ اِلٰی شُرَکَآئِھِمْ۔ جو حصہ خدا کے لئے الگ کرتے ہیں، وہ پھر پھرا کر، پھر ان کے شرکاء تک پہنچ جاتا ہے۔ اور یوں ان کی یہ (LIMITED COMPANY) خدا کے نام پر، سب کچھ سمیٹ کر لے جاتی ہے۔ سَآءَ یَحْکُمُوْنَ (۱۳۶/۶)۔ کس قدر برا ہے یہ فیصلہ جو یہ لوگ کرتے ہیں — اسی طرح عیسائیوں کے مذہبی پیشوا، معافی نامے بیچا کرتے تھے۔ لہٰذا یہ مسئلہ دینی نہیں معاشی ہے اور جب تک اس پر پوری سنجیدگی سے غور کر کے اس کا مناسب حل تجویز نہیں کیا جاتا، قوم میں قانون کے احترام اور اس کی پابندی کا جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ یاد رکھئے! معاشرہ کی عمارت خدا کے تصور کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے جب تک آپ اس تصور کو قرآنی خطوط پر متشکل نہیں کرتے، معاشرہ میں اصلاح کی صورت پیدا ہو نہیں سکتی۔ اس لئے کہ جس قسم کا خدا کا تصور اسی قسم کا معاشرہ۔ یہ ہے انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کا اصل الاصول۔ اس سے آپ نے یہ بھی دیکھ لیا ہوگا کہ خدا پر ایمان کے معنی کیا ہیں اور یہ ایمان کس طرح انسانی اعمال کی بنیاد قرار پاتا ہے۔ مروجہ مذہب کی رو سے ہمارا خدا کے متعلق تصور غلط ہے۔ اس لئے ہمارا خدا پر ایمان بھی صحیح نہیں۔ ہمیں پہلے قرآن کریم کی روشنی میں خدا کا صحیح تصور قائم کرنا چاہیئے (اور وہ صحیح تصور ہے ایسا خدا جس کے ہاں قانون کی حکومت کارفرما ہے) اور پھر اس تصور کے مطابق خدا پر ایمان لانا

چاہیئے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں قرآن نے خود مسلمانوں سے بھی خدا پر از سر نو ایمان لانے کا مطالبہ کیا ہے۔ خدا پر ہی نہیں بلکہ اس کے رسول اور کتاب پر بھی از سر نو ایمان لانے کا مطالبہ ــــــ اس نے کہا ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي أَنزَلَ مِن قَبْلُ (۴/۱۳۶)۔

اے مسلمانوں! تم ایمان لاؤ خدا پر۔ اس کے رسول پر۔ اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر نازل کی۔ اور ان کتابوں پر جو اس سے پہلے نازل کی گئی تھیں"۔

اس ایمان کے بعد آپ دیکھیں گے کہ ہمارے معاشرہ میں کس طرح "قانون کی حکومت" کارفرما ہوتی ہے۔

والسلام

قرآنی فیصلے

جلد اوّل و دوم

ہماری زندگی کے مختلف معاملات کے بارے میں خدا کی کتاب کا فیصلہ کیا ہے؟ اس سے متعلقہ استفسارات اور ان کے جوابات طلوع اسلام میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ۱۹۵۳ء میں ان کا مجموعہ "قرآنی فیصلے" کے نام سے شائع ہوا اور ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ اس کے نئے ایڈیشن کے لئے تقاضوں کی بھرمار رہی۔ دس گیارہ سال کی اس مدت میں استفسارات اور ان کے جوابات کا یہ سلسلہ طلوع اسلام میں برابر ترقی پذیر رہا۔ اور اب انہیں یکجا کر کے حسب ضرورت ایک نئی ترتیب دی گئی ہے ــــــ اور اس وقت تک تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔

یہ جلدیں سستے ایڈیشنوں میں شائع کی گئی ہیں

قیمت:- جلد اوّل۔ سوا تین روپے جلد دوم۔ سوا تین روپے۔ جلد سوم تین روپے

ملنے کا پتہ- ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی گلبرگ۔ لاہور

ادارہ طلوع اسلام کی انقلاب آفریں پیش کش

سلسبیل

قرآنی فکر کا چشمۂ رواں
فرقانی بصیرت کی جوئے شیر

یعنی مفکرِ قرآن محترم پرویز صاحب کے انقلاب انگیز مضامین کا
تازہ مجموعہ

قرآن کریم کی حیات بخش تعلیم۔ پرویز کا حسین انداز بیان
اور ادارہ کی پیش کش — تینوں یکجا۔

کتابت طباعت دیدہ زیب۔ کاغذ و بائنڈ پرنٹنگ۔ جلد عمدہ۔ گرد پوش جاذب نگاہ۔

ضخامت —— ساڑھے تین سو صفحات

قیمت:۔ مجلد۔ آٹھ روپے

ملنے کا پتہ:۔ ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

حقائق و عبر

لاوارثوں کی امداد

گذشتہ جنوری میں لاہور کے صحافی ضمیر قریشی (مرحوم) رات کی تاریکی میں گولیوں کا نشانہ بنا دیئے گئے تھے (مجرموں کا سراغ ابھی تک نہیں لگ سکا)۔ اخبارات میں شائع شدہ اطلاعات کے مطابق، ضمیر مرحوم کے پس ماندگان کی امداد کے لئے، حکومت مغربی پاکستان نے چودہ ہزار روپیہ دیا ہے۔ (یعنی پانچ ہزار گورنر صاحب نے اور ایک ایک ہزار روپیہ نو وزیر دل میں سے ہر ایک نے)۔ صدر مملکت نے اس سے پہلے، دو ہزار روپیہ اس فنڈ میں عطا کیا ہے۔ اور مرکزی وزیر اطلاعات نے وعدہ کیا ہے کہ مرکزی حکومت بھی اس فنڈ میں امداد دیگی۔ (بحوالہ مشرق۔ ۱۱ مارچ)۔ یہ اطلاعات بڑی اطمینان بخش ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ (جیسا کہ اس اخبار نے لکھا ہے) مرحوم کا نعم البدل تو ان کے پس ماندگان کو نہیں مل سکتا، لیکن اس قسم کے اقدامات سے ان کے اندر یہ احساس ضرور پیدا ہوگا کہ وہ اس بے رحم دنیا میں بے سہارا نہیں۔ ہم ان تمام حضرات کو جنہوں نے اس فنڈ میں کچھ دیا ہے، مستحق صد تبریک و تہنیت سمجھتے ہیں۔

لیکن اس مقام پر ایک اور سوال سامنے آتا ہے۔ جس روز ضمیر مرحوم کو قتل کیا گیا تھا، اس سے غالباً ایک ہی دن پہلے، مال روڈ پر دن دہاڑے، ایک غریب پھل بیچنے والے کو بھی راستہ چلنے والوں کے سامنے گولیوں کا نشانہ بنا دیا گیا تھا۔ اور اس کے پس ماندگان بھی اسی طرح لاوارث اور بے سہارا رہ گئے۔ لیکن یہ اطلاع کہیں سے نہیں ملی کہ ان کی امداد کے لئے بھی حکومت کی طرف سے کوئی اقدامات ہوئے — اور یہ چیز اس پھل بیچنے والے کے ورثاء تک ہی محدود نہیں۔ ملک میں آئے دن اس قسم کے قتل ہوتے رہتے ہیں۔ مرنے والا تو ایک ثانیہ میں مر جاتا ہے، لیکن اس کے لاوارث پس ماندگان، عمر بھر مرنے سہتے ہیں۔ ان کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا — ان کی امداد کے لئے کوئی انتظام نہیں ہوتا۔ مجرم اگر عدالت کی طرف سے سزا پاکر پھانسی کے تختے پر بھی لٹکا دیئے جائیں، تو یہ بھی ان پس ماندگان کی مصیبتوں کا حل نہیں ہو سکتا۔

یہ عمر بھر دکھ جھیلتے رہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس قسم کے بے سہارا لوگوں کو زندگی کا سہارا بہم پہنچانے کا بھی کوئی انتظام ہے؟ ہمارے معاشرہ میں تو اس کا کوئی انتظام نہیں! قرآن کریم نے جب مقتول مظلوم کے وارث کے متعلق کہا تھا کہ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا (۱۷/۳۳)۔ وہ یہ نہ سمجھے کہ وہ بے یار و مددگار ہے۔ اس کا مددگار اسلامی نظام ہے، تو اس میں صرف مجرم کی سزا دہی کا سوال نہیں تھا، مقتول کے بے سہارا ورثاء کی امداد کا بھی سوال تھا۔

کیا ہمارے ارباب حل وعقد اس اہم سوال کی طرف توجہ فرمائیں گے، تاکہ ایک سیکنڈ میں یوں بے سہارا رہ جانے والے بدنصیبوں کو کم از کم اتنا تو اطمینان ہو کہ وہ "اس بے رحم دنیا میں بے سہارا نہیں"۔

۲۔ معارف و حقائق

(دارالعلوم) دیوبند سے شائع ہونے والے ماہنامہ تذکرہ کی فروری ۶۵ء کی اشاعت میں "معارف و حقائق" کے عنوان سے حسب ذیل معارف و حقائق شائع ہوئے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

ویران مقامات کی آبادی

جس زمانہ میں ملکہ کی تاج پوشی کا جلسہ ہوا تھا اس زمانہ میں مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ دہلی میں رہتے تھے، مگر اکثر غائب رہتے تھے، جب دریافت کیا گیا کہ حضرت! آپ کہاں رہتے ہیں، تو فرمایا! کہ مجھ کو حکم ہوا ہے کہ دہلی میں جس جس جگہ تمہارا قدم جائے گا ہم اس جگہ کو آباد کر دیں گے اس لئے میں اکثر شہر اور حوالی شہر میں گشت کرتا ہوں تاکہ ویران مقامات آباد ہو جائیں۔

اور واقعہ بھی ایسا ہی ہوا جہاں جہاں آپ کے قدم پہونچے وہ تمام جگہیں آباد ہو گئیں (امیر الروایات)

جاڑا بخار کو آرام

ایک مرتبہ نانوتہ میں جاڑہ بخار کی بہت کثرت ہوئی جو شخص حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی قبر سے مٹی لے کر باندھ لیتا بس اسے فوراً آرام ہو جاتا، چنانچہ لوگ اس قدر کثرت سے مٹی لے گئے کہ جب بھی قبر پر مٹی ڈالی جاتی ختم ہو جاتی، جب یہ کیفیت ہوئی تو ایک مرتبہ مولانا کے صاحبزادے نے قبر پر جا کر کہا کہ آپ کی تو کرامت ہوئی اور ہماری مصیبت ہو گئی، اگر اب کے کوئی اچھا ہوا تو ہم مٹی نہ ڈالیں گے۔

پس اسی دن سے پھر کسی کو آرام نہیں ہوا اور لوگوں نے مٹی لے جانا بند کر دیا۔

مخلیات پر اعتقاد

ایک مرتبہ ایک شخص کا مقدمہ سہارنپور میں ڈپٹی ظہیر عالم کی عدالت میں پیش ہوا، وہ شخص عابد حسین صاحب دیوبندی

رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور مقدمہ میں کامیابی کا تعویذ مانگا۔ حاجی صاحبؒ نے دیدیا اور فرمایا کہ جب عدالت میں جانا تو اس کو اپنی پگڑی میں رکھ لینا۔ وہ شخص جب عدالت میں اجلاس پر پہونچا اور ڈپٹی نے کچھ سوال کیا تو اس کو یاد آیا کہ تعویذ بھول گیا ہوں چنانچہ ڈپٹی صاحب سے کہا کہ۔ ابھی ابھی ٹھہر جاؤ میں دیوبند والے حاجی صاحب کا تعویذ لایا ہوں اس کو لے آؤں تب پوچھنا۔ ڈپٹی صاحب یہ سن کر ہنسے کیونکہ وہ عملیات پر اعتقاد نہ رکھتے تھے۔

جب وہ شخص تعویذ لے آیا، تب کہا کہ اب پوچھو کیا پوچھ رہے تھے۔ ڈپٹی صاحب نے کچھ سوالات کئے اور پھر اپنے خیال میں قصداً اس مقدمہ کو بگاڑ دیا، مگر جب فیصلہ لکھ کر پڑھنے بیٹھے تو وہ موافق تھا۔ یہ دیکھ کر ڈپٹی صاحب بہت پشیمان ہوئے۔ حاجی صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر معذرت خواہ ہوئے۔ حضرت نے فرمایا کہ عمل کا یہ اثر ہوتا ہے کہ بعض اوقات جب وہ معمول پر اثر انداز ہوتا ہے تو اس کا دماغ صحیح نہیں رہتا اور جب دماغ صحیح نہیں رہتا تو کام بھی ایسے ہی ہوتے ہیں۔

پانی کی جگہ سونے سے بھرا ہوا ڈول۔

ایک بزرگ کو ایک روز عصر کی نماز میں دیر ہوگئی دوڑتے ہوئے وضو کے لئے کنویں پر گئے۔ کنویں کے اندر ڈول ڈالا تو پانی کے بجائے چاندی سے بھرا ہوا نکلا۔ ان بزرگ نے پھینک دیا، اور جناب باری میں عرض کیا کہ مذاق نہ کرو مجھے تو نماز کو دیر ہوئی جا رہی ہے۔ پھر دوبارہ ڈول ڈالا تو اب کے سونے سے بھرا ہوا نکلا، پھر عرض کیا کہ مذاق نہ کرو مجھے تو نماز میں دیر ہوئی جاتی ہے۔ اس وقت ان کو یہ الہام ہوا کہ ہم نے تمہارے ساتھ یہ معاملہ اس لئے کیا تاکہ لوگ تم کو حقیر نہ جانیں۔ وہ بزرگ جولاہے تھے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا آنکھیں بنوانے سے انکار۔

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی آنکھ میں پانی اتر آیا، تو آنکھ بنانے والے حاضر خدمت ہوئے اور عرض کیا کہ اجازت ہو تو ہم آنکھ بنا دیں، لیکن پانچ دن تک آپ کو احتیاط کرنا پڑے گی، سجدہ زمین کے بجائے کسی اونچی لکڑی پر کرنا ہوگا، آپ نے فرمایا کہ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ واللہ ایک رکعت بھی ہم اس طرح پڑھنا منظور نہیں کر سکتے، حضورؐ کا ارشاد مجھے معلوم ہے کہ جو شخص ایک نماز بھی جان بوجھ کر چھوڑ دے گا وہ حق سبحانہ تعالیٰ سے اس طرح ملے گا کہ اس پر ناراض ہونگے (از درمنثور)

طلوع اسلام

یہ ہے وہ علم جسے حاصل کرنے کے بعد ہمارے ہاں عالم کہلانے لگ جاتے ہیں۔

۳۔ قرآن سے (معاذ اللہ) مذاق

دین کے نظام میں مشاورت کی صحیح حیثیت کیا ہے اس کے متعلق سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے

کبھی یہ بتایا تھا کہ

"جب امیر کو چن لیا جائے گا تو اس کو سیاہ و سفید کے اختیارات ہوں گے۔ امیر کو مشورہ کے ساتھ کام کرنا ہوگا۔ عموماً مجلس کے فیصلے کثرت رائے سے ہوں گے۔ مگر اسلام تعداد کی کثرت کو حق کا معیار تسلیم نہیں کرتا۔ اسلام کے نزدیک یہ ممکن ہے کہ ایک اکیلے شخص کی رائے پوری مجلس کے مقابلے میں برحق ہو۔ اور ایسا ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ حق کو اس لئے چھوڑ دیا جائے کہ اس کی تائید میں ایک جم غفیر نہیں ہے۔ لہٰذا امیر کو حق ہے کہ اکثریت کے ساتھ اتفاق کرے یا اقلیت کے ساتھ۔ اور امیر کو یہ بھی حق حاصل ہے کہ پوری مجلس سے اختلاف کر کے اپنی رائے پر فیصلہ کرے۔ (اسلام کا سیاسی نظریہ ص۴۵-۴۶)

اس سے بھی واضح تر الفاظ میں انہوں نے ترجمان القرآن کی جون ۱۹۴۸ء کی اشاعت میں لکھا تھا کہ

" امیر مملکت شوریٰ کی اکثریت کے مقابلے میں ویٹو کا استعمال کر سکیگا۔ (ص۲۳)

جماعت اسلامی نے پاکستان کے آئین کے سلسلے میں جو دستوری خاکہ مرتب کیا تھا اس کی دفعہ ۳۱ میں یہ کہا گیا تھا کہ

ویٹو عین اسلام | " امیر کو مجلس شوریٰ کی اکثریت کے مقابلہ میں ویٹو کا حق حاصل ہوگا۔

(دو دستوری خاکے۔ ص۲۳)

لیکن حال ہی میں جو ترجمان القرآن (بابت مارچ ۱۹۶۵ء) موصول ہوا ہے اس میں مودودی صاحب نے سورۃ الشوریٰ کی آیت — وَ اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

پنجم یہ کہ جو مشورہ اہلِ شوریٰ کے اجماع (اتفاق رائے) سے دیا جائے، یا جسے اُن کے جمہور (اکثریت) کی تائید حاصل ہو اُسے تسلیم کیا جائے۔ کیونکہ اگر ایک شخص یا ایک ٹولہ سب کی سننے کے بعد اپنی من مانی کرنے کا مختار ہو تو مشاورت بالکل بے معنی ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرما رہا ہے کہ " ان کے معاملات میں اُن سے مشورہ لیا جاتا ہے" بلکہ یہ فرما رہا ہے کہ "ان کے معاملات آپس کے مشورے سے چلتے ہیں۔" ارشاد کی تعمیل محض مشورہ لے لینے سے نہیں ہو جاتی، بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ مشاورت میں اجماع یا اکثریت کے ساتھ جو بات طے ہو اُسی کے مطابق معاملات چلیں۔

آپ نے ایک ہی آیت کی دونوں تفسیریں ملاحظہ فرمالیں۔ پہلی تفسیر کا "شانِ نزول" مودودی صاحب کی اپنی امارت ہے۔ اور دوسری کا "شانِ نزول" ایوب خان صاحب کی صدارت۔ قرآن کے ساتھ ایسا مذاق بھی کم دیکھنے میں آیا ہوگا!

۴۔ سیلِ بے پناہ

اس وقت عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ دنیا کی تباہی ایٹم بم کے ہاتھوں ہوگی۔ اگر تیسری عالمگیر جنگ چھڑ گئی تو صفحۂ ارض پہ

شاید ایک متنفس بھی باقی نہ رہے۔ اس لئے بہی خواہانِ نوع انسان کی انتہائی کوشش یہ ہے کہ تیسری جنگ کی نوبت نہ آنے پائے اور دنیا امن میں رہے۔

لیکن مفکرین کا ایک اور طبقہ ہے جو اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ ہمارے اس جہان پیر کی موت جنگ کے ہاتھوں نہیں بلکہ امن کی حالت سے ہوگی۔ آپ حیران ہونگے کہ یہ کس طرح؟ اس کی وجہ بالکل واضح ہے۔ ان لوگوں کا اندازہ یہ ہے کہ جس رفتار سے انسانوں کی آبادی بڑھ رہی ہے، کچھ عرصہ کے بعد یہ اسقدر پھیل جائے گی کہ نہ تو زمین پر انسانوں کے رہنے کے لئے جگہ ملے گی اور نہ ہی ان کے کھانے کے لئے خوراک۔ ان کا یہ اندازہ محض قیاسات پر مبنی نہیں۔ اعداد و شمار پر مبنی ہے۔ مسئلہ آبادی کے محققین کی تحقیق یہ ہے کہ

(۱) آج سے دو ہزار سال پہلے (حضرت عیسٰیؑ کی پیدائش کے وقت) دنیا کی آبادی بمشکل بیس اور تیس کروڑ کے درمیان تھی۔

(۲) اس وقت دنیا کی آبادی (۳' اعشاریہ ۱) ارب ہے۔

(۳) ۱۹۵۰ء میں آبادی (۲' اعشاریہ ۴) ارب تھی۔

(۴) آج سے تین سو سال پہلے آبادی' نصف ارب تھی۔

(۵) گذشتہ ساٹھ سال میں آبادی ڈیڑھ ارب سے بڑھ کر تین ارب ہوگئی۔

(۶) اس حساب سے ۲۰۰۰ء میں آبادی چھ ارب ہو جائے گی۔

(۷) اور آج سے ایک سو سال کے بعد یہ آبادی ۳۶۔ ارب ہو جائے گی جس کے معنی یہ ہوں گے کہ صفحۂ ارض پر تل دھرنے کو جگہ باقی نہیں رہے گی۔

(۸) مصیبت یہ ہے کہ پس ماندہ علاقوں میں (یعنی جہاں غربت اور افلاس زیادہ ہو) آبادی بڑی تیزی سے بڑھتی ہے۔

(۹) اس وقت تک اقوام عالم نے جس قدر کوشش کی ہے اس کے باوجود' پیداوار کی رفتار آبادی کی رفتار کے برابر نہیں ہو سکی۔ ۱۹۴۷ء اور ۱۹۵۳ء کے درمیان' خوراک کی پیداوار آٹھ فیصد بڑھی لیکن آبادی گیارہ فیصد بڑھ گئی [۱] اور اس کے بعد آبادی نے جس برق رفتاری سے بڑھنا ہے' پیداوار میں افزائش اس کا کسی صورت میں بھی ساتھ نہیں دے سکے گی۔

یہ ہیں وہ حقائق جن کے پیش نظر' یہ مفکرین اس پریشانی میں مبتلا ہیں کہ نوع انسان کے لئے سب سے بڑا خطرہ اس کی بڑھتی ہوئی آبادی ہے جس کی وجہ سے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد یہ کشتی سواریوں کی کثرت کے بوجھ سے ڈوب جائے گی۔ اس لئے یہ لوگ چلا چلا کر کہہ رہے ہیں کہ خدا کے لئے برتھ کنٹرول (ضبط تولید) کی اسکیم کو عالمگیر بناؤ اور اس پر بڑی سختی سے عمل کراؤ۔ اس کے ساتھ انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اس اسکیم کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ مذہب پرست طبقہ ہے جو ضبط تولید

---

[۱] یہ اعداد و شمار جرمنی سے شائع ہونے والے میگزین (MEDICAL MIRROR) کے شمارہ نمبر ۶ بابت ۱۹۶۴ء سے لئے گئے ہیں۔

کو خلافِ شریعت قرار دیتا ہے۔ مغربی ممالک کا "مُلا" اس باب میں کیا دلیل پیش کرتا ہے اس کا تو ہمیں علم نہیں۔ لیکن ہمارے ہاں کے مُلا کے پاس اس کی ایک ہی دلیل ہے۔ اور وہ یہ کہ خدا رازق ہے۔ اور اولاد پر پابندی عائد کرنے کی کوشش، اس کی رزاقیت پر ایمان کے خلاف ہے۔ وہ یہ کہہ کر مطمئن ہو جاتا ہے کہ میں نے بڑی محکم دلیل پیش کر دی ہے لیکن نہیں سمجھتا کہ (اگر خدا کی رزاقیت کا وہی مفہوم ہے جو اُس نے سمجھا رکھا ہے تو) آج دنیا کی آدھی آبادی رات کو بھوکی کیوں سوتی ہے؟ اُس وقت، انسانی آبادی کا دو تہائی سے لیکر ایک تہائی تک حصہ ایسا ہے جسے اتنا کھانے کو نہیں ملتا جتنا ان کی پرورش کے لئے ضروری ہے۔ یہ حالت آج ہے۔ جب چالیس سال کے بعد آبادی تین ارب سے چھ ارب۔ اور سو سال کے بعد چھتیس ارب ہو جائے گی تو اُس وقت جو حالت ہو گی اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے!

قرآن کریم نے پلان (PLAN) کے مطابق اولاد پیدا کرنے کی طرف اُس زمانے میں اشارہ کیا تھا جب دنیا کے سامنے ہنوز اس قسم کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ لیکن اس نے ضبطِ تولید کا طریقہ ضبطِ نفس بتایا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ تم بیوی کے پاس جاؤ ہی اُس وقت جب اولاد پیدا کرنا مقصود ہو جس طرح کسان قلبہ رانی اس وقت کرتا ہے جب فصل پیدا کرنا مطلوب ہو۔

(۲ : ۲۲۳)

۵۔ پارٹی بازی کی لعنت

قرآن کریم نے گروہ بندانہ ذہنیت کو (خواہ آپ اس کا نام فرقہ بندی رکھ لیں یا۔ پارٹی بازی۔ مفہوم دونوں کا ایک ہی ہے) بہ نصِ صریح شرک قرار دیا ہے۔ وجہ اس کی ظاہر ہے۔ توحید یہ ہے کہ جب آپ کے سامنے خدا کا کوئی فیصلہ آجائے تو پھر کسی اور کا فیصلہ یا خود آپ کا رجحان اس پر غالب نہ آئے۔ اور شرک یہ ہے کہ آپ خدا کے فیصلے جیسی حیثیت کسی اور کے فیصلے کو دیدیں۔ اس قسم کا شرک پارٹی بازی میں قدم قدم پر سامنے آتا ہے۔ آپ کسی فیصلے کو بہ دلائل و براہین اور علیٰ وجہ البصیرت، دینِ خداوندی کے مطابق پاتے ہیں لیکن آپ کی پارٹی کا فیصلہ اس کے خلاف ہوتا ہے۔ اب پارٹی کے دستور و ضوابط کا تقاضا ہے کہ آپ اُس کے فیصلے کو مانیں۔ اور نہ صرف خود ہی مانیں بلکہ اس کی تبلیغ و اشاعت بھی کریں۔ اس کے حق میں دلائل تراشیں۔ غلط توجیہات پیش کریں۔ خدا کے اُس فیصلے کی جسے آپ نے ابھی ابھی حق سمجھا تھا، تاویلات کریں۔ اور اس طرح لوگوں کو قائل کریں کہ آپ کی پارٹی کا فیصلہ حق پر مبنی ہے۔ پارٹی پرستی کی اس قسم کی ایک بین (اور بڑی ہی درد انگیز) مثال ہمارے سامنے، محترم کوثر نیازی صاحب کے اُس مکتوب میں آئی ہے جسے انہوں نے، جماعت اسلامی سے الگ ہوتے وقت، جماعت کے امیر مودودی صاحب کے نام بھیجا ہے۔ اس میں لکھا ہے:۔

میں آپ کے سامنے انتہائی مذامت کے ساتھ خود اپنے بارے میں بھی یہ اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ اپنے حقیر سے علم اور مطالعہ کی بنا پر میری رائے یہی تھی کہ موجودہ سیاسی اور جمہوری روایات کی بات تو دوسری ہے لیکن شرعاً عورت کسی بھی صورت میں

صدر مملکت نہیں بنائی جاسکتی اور اس کا تو میں کوئی تصور اپنے ذہن میں نہیں رکھتا تھا کہ کبھی ہم بھی اسلام کے نام پر ایک خاتون کی حمایت میں ایسی تحریک چلا سکتے ہیں چنانچہ میں نے اپنی مسجد میں سوالات کا جواب دیتے ہوئے سینکڑوں افراد کے سامنے قرآن وحدیث کے دلائل سے اپنے اس عقیدے کی وضاحت کی اور بعد میں بعض اخباری نمائندوں کی خواہش پر اس خطبہ کا خلاصہ اخبارات کو بھی بھجوا دیا مگر اس دوران مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ جماعت اس سے الگ نقطۂ نظر پر سوچ رہی ہے اور امکان غالب اس کا ہے کہ مس فاطمہ جناح کی حمایت کا فیصلہ کیا جائے گا۔ میں اس انکشاف پر سراسیمگی کا شکار ہو کر رہ گیا اور جماعت کے فیصلے کے انتظار میں اس بیان کو واپس لے لیا۔

مجھے بعد میں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ نے جیل سے مرکز جماعت کو یہ ہدایت بھجوائی ہے کہ اس مسئلہ پر ہرگز متحدہ حزب اختلاف کا ساتھ نہ دیا جائے۔ آپ کی گذشتہ تحریروں کی روشنی میں ابھی اس بات کی توقع تھی لیکن جب مجلس مشاورت میں جیل سے آئی ہوئی آپ کی وہ تحریر پڑھ کر سنائی گئی (جسے بعد ازاں لفظ بلفظ مجلس مشاورت کی قرارداد کی صورت میں اخبارات کو ارسال کر دیا گیا) تو میرے حسن ظن کو انتہائی ٹھیس پہنچی۔ شاید آپ کو معلوم نہ ہو میں یہاں بھی وضاحت کر دوں کہ مجلس مشاورت کے جس اجلاس میں محترمہ کی حمایت کا فیصلہ کرتے ہوئے اس قرارداد کو منظور کیا گیا میں اس میں اپنی غلط فہمی (یا وقت کے بارے میں غلط اطلاع!) کی وجہ سے شریک نہ ہو سکا جب میں پہنچا تو یہ قرارداد اخبارات کو بھجوائی جا چکی تھی۔ کاش! میں اس وقت موجود ہوتا اور اس غلط نظریہ پر اہل مجلس کو متنبہ کر کے کم از کم قرارداد کے الفاظ تو تبدیل کرا دیتا۔ ظاہر ہے اس کے بعد "تیر از کمان رفت" والا معاملہ تھا اب جماعتی دستور کی رو سے میں اس فیصلہ کی تائید پر مجبور تھا اور جس رائے کو میں دلائل کی بناء پر مرجوح بلکہ غلط سمجھتا تھا اب صرف اس لئے کہ وہ بطور قرارداد منظور ہو چکی ہے جماعت اور مجلس مشاورت کا رکن ہونے کی وجہ سے میں تحریر وتقریر کے ذریعے اس کی تائید وتوثیق کرنے لگا۔

مولانا! میں بہت گناہ گار ہوں مگر میری پوری زندگی کے گناہ ایک طرف اور یہ اکیلا گناہ دوسری طرف کہ میں نے جس بات کو شرعاً درست نہیں سمجھا تھا صرف جماعتی قواعد وضوابط کی وجہ سے اس معصیت پر مجبور ہو گیا کہ اب اس کی نمائندگی کروں۔ اللہ میرے اس جرم کو معاف فرمائے ورنہ ڈرتا ہوں کہ کہیں اس جرم کی وجہ سے میرا دل رہے سہے ایمان ہی سے محروم نہ ہو جائے

نعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا۔

(شہاب۔ مورخہ ۲۸ر فروری ۱۹۶۵ء)

آپ اس واقعہ کو سامنے رکھئے اور پھر غور کیجئے کہ کس قدر عبرتناک ہے پارٹی بازی کے شرک کی یہ مثال۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ جب بھی "خدا پرستی" سے نیچے اتر کر "اشخاص پرستی" پر آ جائیں گے تو اس کا نتیجہ یہی ہوگا۔

ہم نے اس مثال کو دردانگیز اور عبرتناک اس لئے لکھا ہے کہ نیازی صاحب نے 'عورت کی سربراہی' کے سلسلہ میں جماعت کے فیصلے کی تائید میں اتنا کچھ لکھا اور کہا تھا کہ اس سے نہ معلوم کتنے لوگ متاثر ہوئے ہوں گے۔ یہ ہیں وہ پیشوایان مذہب جن کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ وہ جب قیامت میں آئیں گے تو ان کی پیٹھ پر ان کے اپنے

گناہوں کا بوجھ بھی ہوگا۔ وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِیْنَ یُضِلُّوْنَهُمْ بِغَیْرِ عِلْمٍ (۱۶/۲۵)۔ اور ان لوگوں کے گناہوں کے بوجھ کا ایک حصہ بھی جنہیں انہوں نے بلا علم گمراہ کر دیا۔ قرآن نے "بغیر علم" کہا ہے۔ لیکن یہاں تو معاملہ اس سے بھی زیادہ سنگین تھا۔ نیازی صاحب جانتے تھے کہ میں جو کچھ لوگوں سے کہہ رہا ہوں وہ غلط ہے۔ اور اس کے باوجود وہ لوگوں کو اس کی طرف بلا رہے تھے!

مودودی صاحب نے محض ایک سیاسی مقصد کی خاطر دیدہ دانستہ اُس فیصلے کو بدلا جسے وہ خود اس سے پہلے خدا اور رسول کا فیصلہ قرار دے چکے تھے۔ اور انکے متبعین نے پارٹی کے ڈسپلن کی خاطر اُس فیصلے کو جس کے متعلق وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ شریعت کے خلاف ہے، شریعتِ حقہ کہہ کر لوگوں کے سامنے پیش کیا۔

اور یہ تو ابھی صرف ایک مثال ہے۔ کیا معلوم اسی طرح کتنی باتوں کو دین بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے! اور یہ وہ جماعت ہے جو خدا کی حاکمیت قائم کرنے کا دعوے لے کر اٹھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر انسان فی الواقعہ خدا کو احکم الحاکمین مان لے تو پھر اس سے اس قسم کی حرکت کبھی سرزد نہیں ہو سکتی۔ پھر اس کے نزدیک سند صرف خدا کی کتاب ہوگی نہ کہ کسی انسان کا قول یا پارٹی کا فیصلہ۔

۶۔ تضادات

ہم نے اوپر کہا ہے کہ نہ معلوم کتنی اور باتوں کو اسی طرح دین بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا اور پیش کیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں محترم نیازی صاحب نے اپنے مکتوب میں جماعت اسلامی کے اقوال و افعال کے تضادات کی ایک فہرست دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"اس پہلو سے میری مایوسی اس وجہ سے اور بھی زیادہ بڑھ گئی ہے کیونکہ ہم نے ۱۹۶۰ء کی انتخابی پالیسی سے لے کر عورت کے مسئلہ صدارت تک ہر متضاد بات کے لئے جس طرح نصوص قرآن و حدیث کو پیش کیا ہے اس کے بعد اس ملک میں کوئی ذی فہم آدمی ہماری پیش کردہ دینی اور اصلاحی دعوت پر اعتماد نہیں کر سکتا۔

تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں، تضادات کا شکار ہوئے جانے کے سارے ادوار آپ سے بڑھ کر کس پر روشن ہوں گے۔ پہلے ہم نے امیدواری کو حرام قرار دیا۔ اس کے لئے صحابہؓ تک کی کسی جلیل القدر شخصیت میں امیدواری کا کوئی پہلو ہمارے سامنے پیش کیا گیا تو ہم نے اپنی اجتہادی رائے کو نص کا درجہ دے کر اس پر تنقید کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا مگر اب ہم اپوزیشن کے ساتھ مل کر امیدواروں سے خود درخواستیں طلب کر رہے ہیں، ہم نے کہا کہ صالح نمائندہ پنچائتی سسٹم سے آئے جس جماعت یا گروہ سے بھی تعلق رکھتا ہو۔ پھر ہم نے صالح نمائندوں کو جماعت کے دائرے میں مخصوص کر دیا۔ پہلے ہم پارٹی ٹکٹ کو لعنت کہتے تھے، اب محاذ کے ساتھ شریک ہو کر "غیر صالحین" کو بھی ٹکٹ بانٹ رہے ہیں۔ ہم نوٹ پر قائداعظم کی تصویر چھاپنے پر سخت برہم تھے۔ صدارتی انتخاب میں ہمارے کارکنوں نے ان کی بہن کے تصویری دوچرگی فروخت کئے۔ پہلے ہم

نے صدارتی سے بھی بڑھ کر امارتی تصور خلافت پیش کیا تھا، اب ہم پارلیمانی نظام جمہوریت کو اسلامی قرار دیتے ہیں - پہلے ہم اسمبلیوں میں اراکین کی الگ پارٹیاں بنانے کو غیر اسلامی قرار دیتے تھے بعد میں ہم نے خود اس پر عمل کیا - پہلے ہم مخلوط جلسوں میں شریک نہیں ہوتے تھے اب مخلوط جلسوں کی صدارت کرتے اور ان میں تقریریں کرتے ہیں، پہلے ہم علماء کے اتحاد کی کوشش کرتے اور موجودہ پارٹیوں کو ساتھ ملانا غلط سمجھتے تھے اب علماء کے اتحاد سے بے نیاز اور سیاسی پارٹیوں کے محاذ کو مضبوط کرنا تقاضائے اسلام سمجھتے ہیں - پہلے ہم خواتین کو ووٹ کا حق دینے میں راضی نہ تھے اب ان کی صدارت تک کے لئے کوشش کرتے ہیں - پہلے ہم ایوب کے زبردست ناقد تھے اب انہی کا ایک حصہ متحدہ حزب اختلاف کی خواتین کمیٹی کی صورت میں منظم ہوا ہے تو ہمارے اکابرین کی بیگمات ان کے جلسوں سے خطاب فرماتی ہیں، پہلے ہم طلباء کو عملی سیاست میں حصہ لینے سے روکتے تھے اب ان سے عملی سیاست میں شریک ہونے کی اپیلیں کرتے ہیں - پہلے ہم جلوسوں اور نعروں کو غیر اسلامی کہتے تھے اب غلاف کعبہ تک کے جلوس نکالتے اور اپنے رہنماؤں کے لئے زندہ باد کے نعرے لگاتے ہیں پہلے ہم ان انسانی (غیر اسلامی) قوانین پر چلنے والی عدالتوں میں مقدمات لے جانا بہت بڑا گناہ سمجھتے تھے اب انہی عدالتوں کو ہم عدل و انصاف کا محافظ قرار دیتے ہیں پہلے ہم وکیلوں کو شیطانی برادری کا رکن سمجھتے تھے اب انہی کو جمہوریت کا سرپرست کہتے ہیں -

میں یہ عرض نہیں کرنا چاہتا کہ ہماری ان باتوں سے کون سی بات صحیح تھی اور کونسی غلط، یہ تو مشتے نمونہ از خروارے ہے اور یقین مانئے انتہائی دکھ کے ساتھ میں نے جماعتی تاریخ کی طرف یہ اشارے کئے ہیں، عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جب اتنے واضح تضادات کو وقت کی گردش کے ساتھ ساتھ ہم اسلامی اور دینی سمجھ کر چھوڑتے اور اختیار کرتے رہے ہیں تو اب "ترک و اختیار" کے ان مظاہروں کے بعد اپنے ارکان کے سوا کون ہمارے دینی فکر پہ بھروسہ کرے گا"؟ (ایضاً)

قارئین کو یاد ہوگا کہ جب ہم ان تضادات کی نشاندہی کیا کرتے تھے تو یہی حضرات ہمیں کافر اور مرتد قرار دیا کرتے تھے ! غور کیجئے کہ اس قسم کے متضاد نظریات کو دین بنا کر پیش کرنے سے یہ لوگ کتنی دنیا کو گمراہ کر چکے ہیں ! لاعلمی کی بات اور ہے - لیکن سوچئے کہ جانتے بوجھتے ایسا کرنا انسان کو کہاں پہنچا دیتا ہے ؟ اللہ ہم سب کو اس سے محفوظ رکھے -

---

۷ - افرو - ایشین مسلم کانفرنس

افریقہ اور ایشیا کے مسلم ممالک کے نمائندگان کی جو کانفرنس حال ہی میں بنڈنگ میں منعقد ہوئی ہے، اس کی کارروائی کو پڑھ کر بڑا صدمہ ہوا - کانفرنس کا سب سے اہم ریزولیشن یہ تھا کہ جو ممالک ابھی تک استعماریت کے جوئے میں جکڑے ہوئے ہیں انہیں حق خود ارادیت دیا جائے - ان ممالک میں فلسطین، انگولا - موزنبیق - عمان اور جنوبی یمن کا نام خصوصیت سے لیا گیا - لیکن کشمیر کو ان میں شامل نہ کیا گیا - جب کانفرنس کی توجہ اس طرف مبذول کرائی گئی تو کمیٹی کے عراقی صدر نے کہا کہ چونکہ یہ مسئلہ ان دو ممالک کے درمیان زیر النزاع ہے جن کے نمائندے اس کانفرنس میں شریک ہیں اس لئے کانفرنس کی کارروائی کو بغیر کسی جھگڑے تنازع کے اختتام پذیر کرنے کے لئے یہی مناسب ہے کہ اس مسئلہ

کو درمیان میں دبا دیا جائے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون! کیا بات ہے ہمارے ان "آزاد" اسلامی ممالک کی اور کیسی معذرت گستری ہے ہمارے اس عراقی صدر کی!

باندھتے ہیں سرو کو آزاد۔ اور وہ پابگل
کیا وہ آزادی جہاں یہ حال ہو آزاد کا!

ٹھیک ہے: بھارت کی نگاہوں میں مفت میں بُرا بننے کی ضرورت کیا ہے۔ کشمیر جائے بھاڑ میں اور اس کے بیکس و مظلوم مسلمان جائیں جہنم میں۔ اس سے "اسلامی ممالک" کے ان نمائندوں کو کیا سروکار۔ مقصد تو یہ ہے کہ کہیں ہندو ناراض نہ ہو جائے!

لیکن ہم اپنے پاکستانی نمائندوں سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ جب انہوں نے کانفرنس کا یہ رویہ دیکھا تھا تو وہ بطور احتجاج کانفرنس کو بائیکاٹ کرکے وہاں سے اٹھ کر کیوں نہ چلے آئے! انہیں اگر اس پر اختیار نہیں تھا کہ عدل و انصاف پر مبنی ایک قرارداد کو پاس کرا سکتے تو اس پر تو انہیں اختیار تھا کہ وہ ایسی بے راہ رو کانفرنس کا بائیکاٹ کر دیتے اور اس طرح ان لوگوں پر اتنا تو ظاہر کر دیتے کہ

تجھ پہ قابو نہیں دل پہ تو ہے قابو اپنا۔

لیکن افسوس کہ ان سے اتنا بھی نہ ہو سکا!

۸۔ کانفرنس اور عائلی قوانین

کانفرنس کے ایک ریزولیشن میں پاکستان کے عائلی قوانین کو سراہا گیا ہے اور دیگر مسلم ممالک سے کہا گیا ہے کہ وہ بھی ان مفید قوانین کو اپنے ہاں رائج کریں۔ (پاکستان ٹائمز۔ مورخہ ۱۴ر مارچ ۱۹۶۵ء)

یہ خبر سے دہی قوانین ہیں جنہیں پاکستان کے مولوی صاحبان خلافِ شریعت قرار دے کر انہیں منسوخ کرانے کے جہاد میں مصروف ہیں۔ اور جن سے متاثر ہو کر ہمارے ارباب اقتدار بھی ڈانواں ڈول ہو رہے ہیں۔ اور اب سنا ہے کہ اسلامی مشاورتی کونسل نے بھی سفارش کر دی ہے کہ ان میں شریعت کے مطابق ترمیم کی جائے۔ غور کیجئے کہ وہ نظارہ بھی کسقدر قابل دید ہوگا جب دیگر اسلامی ممالک ان قوانین کو اپنے ہاں نافذ کرکے پاکستان کو خراج تحسین ادا کریں گے اور پاکستان ان قوانین کو منسوخ کرکے پھر اسی تاریک غار میں پہنچ چکا ہوگا جہاں سے اسے زمانے کے تقاضے اور قرآن کی روشنی کشاں کشاں نکال کر لائی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان جس شان سے تاریخ کے صفحات پر ابھرا تھا اس کے حصے میں مسلم ممالک کی لیڈرشپ آسکتی تھی۔ لیکن یہ بیں بری طرح زمین کی پستیوں سے ساتھ جا کر چپکا ہے اس سے اس کا کوئی امتیازی مقام ہی نہیں رہا۔ اور یہ کوئی نئی بات نہیں۔ دنیا کی تاریخ گواہ ہے کہ جو قوم بھی قدامت پرست چھلاووں سے ڈرتی رہی، وہ دنیا میں کبھی کوئی نمایاں پوزیشن حاصل نہیں کر سکی۔ معاشرہ میں صحیح تبدیلی پیدا کرنے کے لئے بڑے جرأت مندانہ اقدام کی ضرورت ہوتی ہے۔

یہ زورِ دست و ضربتِ کاری کا ہے مقام
میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ

باب المراسلات

رشوت کیسے ختم ہو؟

سوال ۔ ہمارے معاشرہ میں رشوت اس قدر عام ہو چکی ہے کہ اس کے متعلق کسی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ خرابی کسی طرح ختم بھی ہو سکتی ہے؟ اس وقت تک اسے روکنے کے لئے جس قدر اقدامات کئے گئے ہیں وہ تو کامیاب ثابت نہیں ہوئے۔ ان سے تو مرض بلکہ اور بڑھ گیا ہے۔

جواب ۔

رشوت ختم کرنے کے لئے جسقدر اقدامات کئے گئے ہیں وہ نہ کامیاب ثابت ہوئے ہیں، نہ کامیاب ثابت ہو سکتے ہیں۔ یہ اقدامات اس کے سوا کیا ہیں کہ انسداد رشوت ستانی کا ایک نیا محکمہ قائم کر دیا جاتا ہے۔ یہ اقدامات کیوں ناکام رہتے ہیں، اس کی وجہ ظاہر ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ دو بھائی ہیں۔ ان میں سے ایک کسی مجسٹریٹ کا اہل مد ہو جاتا ہے۔ اور وہ رشوت لیتا ہے۔ دوسرا بھائی محکمہ انسداد رشوت میں سپاہی بھرتی ہو جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جو محرکات اس اہلمد کو رشوت لینے پر آمادہ کرتے ہیں وہی محرکات اس دوسرے بھائی کو رشوت لینے پر آمادہ کیوں نہیں کریں گے؟ قانونی ممانعت دونوں کے لئے یکساں ہے۔ اگر وہ ایک کے لئے مؤثر ثابت نہیں ہوتی تو دوسرے کے لئے کس طرح مؤثر ہو جائے گی۔ باقی رہا گرفتاری کا خطرہ۔ سو وہ دوسرے بھائی (سپاہی) کے لئے اور بھی کم ہے۔ لہٰذا اس قسم کے اقدامات ایسے جرائم کے انسداد کے لئے مؤثر نہیں ثابت ہو سکتے" تاوقتیکہ ہم محکمہ انسداد رشوت کے لئے کہیں سے ایسے فرشتے نہ لائیں جن کا خمیر کسی اور ہی مٹی سے اٹھا ہو۔ اور یہ بات ہمارے معاشرہ میں مشکل ہی سے میسر آ سکتی ہے۔

اس خرابی (اور اس قسم کی دوسری خرابیوں) کے انسداد کے لئے دو تدبیریں ہیں۔ ایک خارجی اور دوسری داخلی خارجی پر عملدرآمد فوری طور پر کیا جا سکتا ہے۔ اور اسی کو ہم پہلے لیتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ انسان رشوت کیوں لیتا ہے؟ ان افراد کو چھوڑ کر جو روپیہ اکٹھا کرنے کی نفسیاتی بیماری کے مریض ہیں، اور جن کی تعداد زیادہ نہیں ہوتی) ناجائز طریق سے روپیہ حاصل کرنے کا جذبہ محرکہ مستقبل کے متعلق عدم حفاظت (INSECURITY) کا احساس ہوتا ہے — شروع میں شعوری طور پر اور بعد میں غیر شعوری طور پر — غلط معاشرہ میں ہر شخص یہ محسوس کرتا ہے کہ آج تو کسی نہ کسی طرح وقت گزر رہا ہے اگر کل کو خدانہ کردہ پھر

کوئی افتاد پڑگئی تو میں کیا کرونگا۔ میری اولاد کیا کریگی۔ ہمارا کوئی پُرسانِ حال نہیں ہوگا۔ ہم فاقے مر جائیں گے۔ میری اولاد تباہ ہو جائے گی۔ یہ احساس اسے چھلاوے کی طرح ڈراتا ہے۔ یہ ہر وقت اس کے اعصاب پر سوار رہتا ہے۔ اس کی وجہ سے وہ جائز، ناجائز ہر طریقے سے زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ بُرے وقت کیلئے کچھ بنالے۔ عدمِ حفاظت کا یہ وہ جذبہ ہے جو اسے چین سے نہیں بیٹھنے دیتا۔ جب تک آپ اس کے دل میں مستقبل کی حفاظت کا یقین نہ پیدا کردیں، وہ روپیہ حاصل کرنے کے جذبہ کو روک ہی نہیں سکتا۔ یہ تھا وہ شافی علاج جسے قرآن نے تجویز کیا تھا اور نظامِ معاشرہ سے کہا تھا کہ تم انہیں یقین دلادو کہ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ (۶/۱۵۲)۔ ہم تمہارے سامانِ زیست کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے بھی۔ یہ گارنٹی اس قدر محکم، متیقن، قابلِ اعتماد اور ناقابلِ تغیر ہونی چاہئے کہ ملسان اس پر دل کے پورے اطمینان سے بھروسہ کرسکے۔ حکومت کے ملازمین کو یہ ضمانت آئینی طور پر ملنی چاہئے — ایسی آئینی طور پر کہ حکومتیں آئیں اور حکومتیں جائیں لیکن ان کی اس ضمانت پر کوئی اثر نہ پڑے۔ تازیست ان کی تمام ضروریات کی کفالت کی ذمہ داری بھی حکومت کے سر پر ہو، اور جب تک ان کی اولاد خود کفیل نہ ہو جائے، ان کی ذمہ داری بھی حکومت کے سر پر۔ حکومت انہیں یہ ضمانت دے، اور اس کے بعد انہیں کسی نوع کی ذاتی جائداد بنانے کی اجازت نہ ہو۔ اگر اتنا کچھ کردینے کے بعد بھی کوئی شخص ناجائز طور پر کچھ حاصل کرے تو اس کی سزا سنگین ترین دی جائے —— یاد رکھئے۔ قرآن کریم نے بعض جرائم کی سزائیں جو اسقدر سنگین بتائی ہیں (مثلاً چوری کی سزا) تو وہ اس بات سے مشروط ہیں کہ پہلے ایسے حالات پیدا کئے جائیں جن میں انسان کو اس قسم کے جرم کے ارتکاب کی ضرورت پیش نہ آئے اور جو اس کے بعد ایسا کرے، اسے سخت سزا دی جائے (بشرطیکہ وہ اپنی اصلاح پر آمادہ نہ ہو)۔

اِسوقت، حکومت کے ملازمین کی کیفیت اس قسم کی ضمانت کے بالکل برعکس ہے۔ سب سے پہلے یہ کہ ان کی تنخواہ، ان کی ضروریاتِ زندگی کے پیشِ نظر مقرر نہیں کی جاتی۔ ایک اسکیل مقرر کردیا جاتا ہے جس کا اطلاق ہر فرد پر یکساں ہوتا ہے۔ یہ ذمہ داری کسی کی بھی نہیں ہوتی کہ وہ دیکھے کہ اس تنخواہ میں اُس ملازم حکومت کی بنیادی ضروریات بھی پوری ہوتی ہیں یا نہیں۔ اگر سروس کے دوران، اس کی موت واقع ہو جاتی ہے تو اس کے پس ماندگان کا کوئی پُرسانِ حال نہیں ہوتا۔ جب اس کی عمر پچاس ساٹھ سال کی ہوتی ہے (جبکہ اس کی اولاد کی ذمہ داریاں پورے شباب پر ہوتی ہیں) تو اسے ریٹائر کرکے اس کی آمدنی ایک ہی دن میں آدھی کردی جاتی ہے۔ پھر اسے سرکاری مکان سے بھی نکال دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد، وہ جس عسرت اور بدحالی کی زندگی بسر کرتا ہے اسے دیکھ کر ہر شخص کے دل میں یہ احساس بیدار ہو جاتا ہے کہ اگر میں نے ایسے وقت کے لئے کچھ جمع نہ کرلیا تو میری بھی یہی حالت ہو جائے گی۔ مستقبل کا یہ بھیانک نقشہ، ہر وقت اس کی نگاہوں کے سامنے رہتا ہے اور اسے، جائز اور ناجائز طریقے سے دولت اکٹھی کرلینے پر آمادہ کرتا رہتا ہے (اِلّا ماشاء اللہ) انہیں اس کا یقین دلایئے کہ ان کی ایسی حالت نہیں ہوگی اور اس کے بعد اگر کوئی ایسی ناجائز حرکت کرے تو اس کی کھال کھنچوا دیجئے

یہ ہے خارجی طریق عمل رشوت بند کرنے کا ـــــ صرف رشوت بند کرنے ہی کا نہیں بلکہ معاشرہ کی بہت سی خرابیاں دور کرنے کا ـــ لیکن چونکہ اس وقت سوال صرف رشوت کا زیر نظر ہے اس لئے ہم دوسری خرابیوں کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے۔ قرآن کا معاشی نظام جس میں ہر فرد کو اپنی بنیادی ضروریات زندگی کی طرف سے پورا پورا اطمینان حاصل ہوتا ہے، معاشرہ کی بیشتر خرابیوں کا علاج ہے۔

اب رہا داخلی طریق، سو اس کا ذریعہ تعلیم ہے ـــ جیسا کہ طلوع اسلام کے صفحات پر اس سے پہلے متعدد بار یہ مثال پیش کی جا چکی ہے۔ ہم انتہائی بھوک کے عالم میں بھی وہ کھانا کبھی نہیں کھاتے جس میں زہر ملا ہوا ہو! اس لئے کہ ہمیں اس کا یقین ہوتا ہے کہ اس سے ہماری ہلاکت ہو جائے گی۔ اس سے ہمیں نقصان پہنچے گا۔ اگر ہم اپنے بچوں کے دل میں شروع ہی سے یہ یقین پیدا کر دیں ـــ اور اس یقین کی بنیاد رسمی عقیدہ پر نہ ہو بلکہ عقل و بصیرت پر ہو، کہ جس طرح زہر آلود کھانے سے ہمارے طبیعی جسم کی ہلاکت ہوتی ہے۔ اسی طرح ناجائز کمائی سے ہماری وہ متاع گراں بہا ضائع ہو جاتی ہے جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے، تو وہ ناجائز کمائی سے اسی طرح اجتناب کریں گے، جس طرح زہر آلود کھانے سے اجتناب کرتے ہیں۔ بالفاظ دیگر، اگر ہم اپنی آنے والی نسلوں کے دل میں قرآن کی دی ہوئی مستقل اقدار کی قدر و قیمت اور اہمیت جاگزیں کر دیں، تو وہ کسی شجر ممنوعہ کے پاس تک بھی نہیں پھٹکیں گے۔ یوں رشوت (اور اس قسم کے دیگر جرائم) کے خلاف جذبۂ نفرت ان کے دل کی گہرائیوں سے ابھرے گا۔ پھر یہی طبقہ قرآن کا معاشی نظام از خود قائم کر دے گا اور اسے مستحکم رکھنا ان کا اندرونی تقاضہ ہو گا۔

یہ ہے اس رشوت بند کرنے کا وہ مؤثر طریقہ جس کی طرف ہماری قرآنی بصیرت ہماری راہ نمائی کرتی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن کریم نے "توکل علی اللہ" پر جو اس قدر زور دیا ہے اور اسے تمام اخلاق حسنہ کا سرچشمہ بتایا ہے، تو اس کا مطلب کیا ہے؟ اس کا مطلب ہے نظام خداوندی (یعنی قرآنی نظام معاشرہ) کی طرف سے کئے گئے وعدوں (یعنی ان کی طرف سے دی گئی ضمانت) پر غیر متزلزل یقین رکھنا۔ ان پر پورا پورا اعتماد کرنا۔ قرآن کی رُو سے تو مملکت کی ضرورت ہی افراد کے دل میں اس قسم کا اعتماد اور یقین پیدا کرنے کے لئے ہوتی ہے۔ جس قدر یہ اعتماد بڑھتا جائے گا خرابیاں کم ہوتی جائیں گی۔ اور کامل اعتماد حاصل ہو گا دلوں میں مستقل اقدار کے احترام اور قرآن کے معاشی نظام کے قیام سے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جو لوگ غلط نظام معاشرہ میں بھی مستقل اقدار کا احترام کرتے اور ان پر پابند رہتے ہیں، وہ بڑی عزیمت کا ثبوت دیتے ہیں لیکن ان کا شمار مستثنیات میں ہوتا ہے۔ اور اس وقت زیر غور سوال یہ ہے کہ وہ کونسی تدبیر اختیار کی جائے جس سے معاشرہ کی عام روش صحیح ہو جائے۔ یہ تدبیر وہی ہے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔

بچوں کا صفحہ

پیارے بچو! تم نے علامہ اقبالؒ کا نام سُنا ہوگا۔ وہ بہت بڑے فلاسفر، شاعر اور قرآن شریف کے عالم تھے۔ انہوں نے پاکستان کی تجویز سب سے پہلے پیش کی تھی۔ ۲۱ر اپریل ۱۹۳۸ء کو ان کی وفات ہوئی تھی۔ انہوں نے بچوں کے لئے بھی کچھ نظمیں لکھی تھیں۔ ان کی یاد میں ہم اس دفعہ بچوں کے صفحہ پر ان کی ایک نظم درج کرتے ہیں جس کا عنوان ہے:-

ہمدردی

ٹہنی پہ کسی شجر کی تنہا — بُلبُل تھا کوئی اُداس بیٹھا
کہتا تھا کہ رات سر پہ آئی — اُڑنے چُگنے میں دِن گذارا
پہنچوں کس طرح آشیاں تک — ہر چیز پہ چھا گیا اندھیرا
سُن کر بُلبُل کی آہ وزاری — جگنو کوئی پاس ہی سے بولا
حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے — کیڑا ہوں اگرچہ میں ذرا سا
کیا غم ہے جو رات ہے اندھیری — ہیں راہ میں روشنی کروں گا
اللہ نے دی ہے مجھ کو مشعل — چمکا کے مجھے دیا بنایا

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

لاہور میں پرویز صاحب کا درس قرآن۔

ہر اتوار کی صبح کو ٹھیک ۹ ر بجے ۲۵۔ ی۔ گلبرگ کالونی میں شروع ہوتا ہے۔ اس پاکیزہ اجتماع میں شریک ہو کر مفکر قرآن کی بصیرت قرآنی سے استفادہ فرمایئے۔

کراچی میں پرویز صاحب کا درس قرآن۔

ہر اتوار کی صبح ٹھیک نو بجے صبح حسب معمول سندھ اسمبلی ہال (بندر روڈ) میں بذریعہ ٹیپ شروع ہوتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ تعداد میں شریک درس ہو کر اس حقیقت کو سمجھئے کہ قرآن انسانی زندگی کے الجھے ہوئے مسائل کا کسقدر واضح اور نکھرا ہوا حل پیش کرتا ہے۔ (نمائندہ بزم طلوع اسلام کراچی)

لائل پور میں پرویز صاحب کے درس قرآنی کا اہتمام

۴۰۸۔ اے پیپلز کالونی میں ہر جمعہ کو نماز مغرب کے بعد بذریعہ ٹیپ پرویز صاحب کے درس قرآن کا باضابطہ اہتمام ہوتا ہے۔

طلوع اسلام کے مستقل خریداروں کیلئے

ضروری وضاحت!

ماہنامہ طلوع اسلام کا سالانہ چندہ ختم ہونے پر اس کے خریداروں کو جو وی۔پی ارسال کیا جاتا ہے وہ عام طور پر طلوع اسلام کے کسی پرانے پرچے پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان خریداروں کی اطلاع کے لئے جو یہ وی۔پی وصول کرتے ہیں، ایک بار پھر یہ وضاحت کی جاتی ہے کہ اس پرانے پرچے سے انہیں کوئی غلط فہمی پیدا نہیں ہونی چاہیئے۔ یہ پرچہ ان کے چندے کے حساب میں شمار نہیں ہوتا۔ بلکہ محض وی۔پی کی وصولی کے لئے ارسال کیا جاتا ہے۔

(ناظم ادارہ)

سنہری مچھلی آپکے ہاتھ بھی لگ سکتی ہے

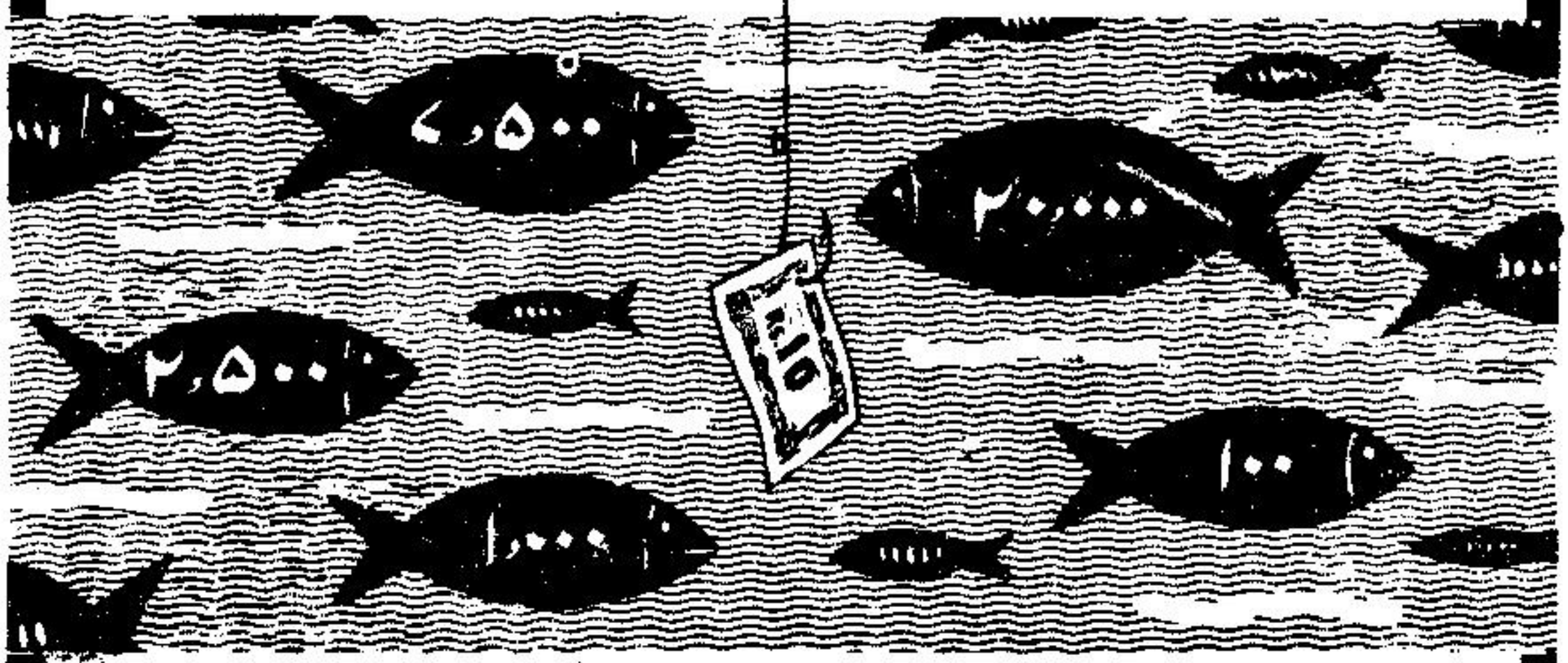

بیس ہزار روپے کا انعام حاصل کرنے کے لئے
آج ہی دس روپے کا انعامی بونڈ خرید لیجئے

ہر ۱۰ روپے والے انعامی بونڈ پر ہر سہ ماہی ۵۰,۰۰۰ روپے کے ۱۳۶ مختلف انعامات تقسیم کئے جاتے ہیں۔ جیتنے والے انعامی بونڈ آئندہ قرعہ اندازیوں میں بھی شامل رہتے ہیں۔
ہر سلسلہ کے جس قدر بونڈ چاہیں خریدیں۔ بھنائے ہوئے بونڈ دوبارہ فروخت کر دیئے جاتے ہیں۔ تاکہ آپ اُن پر بھی انعام حاصل کر سکیں۔
انعامی بونڈ ہر منظور شدہ بینک۔ ڈاکخانوں و ذیلی ڈاکخانوں سے دستیاب ہیں۔

انعامی بونڈ

کنبہ کے لئے بچایئے — قوم کے لئے بچایئے

ایڈیٹر۔ صفدر سلیمی۔ پبلشر۔ سراج الحق۔ مقام اشاعت۔ ۲۵۔بی۔ گلبرگ۔ لاہور۔ مطبع۔ اشرف پریس، ۷۔ ایبک روڈ۔ لاہور

وہ کتابیں جن سے اسلام کا صحیح تصور سامنے آجاتا ہے

لغات القرآن — قرآن کریم کے تمام الفاظ کا مستند، واضح اور حقیقی مفہوم جس سے قرآنی تعلیم نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ یہ قرآن کی ڈکشنری نہیں بلکہ انداز میں اس کی تفسیر ہے۔ پہلی تین جلدوں کی قیمت۔ پندرہ روپے فی جلد۔ چوتھی جلد کی قیمت۔ بارہ روپے **مکمل سیٹ** کی رعایتی قیمت پچاس روپے۔

اسلام کیا ہے؟ — دین کے بنیادی تصورات کا نہایت حسین اور دل کش مرقع قسم اعلیٰ (آٹھ روپے) چیپ ایڈیشن (چار روپے)۔

قرآنی فیصلے — زندگی کے مختلف مسائل اور معاشرہ کے معاملات کے متعلق قرآن کیا کہتا ہے۔ بڑی معلومات افزا کتاب ہے جلد اوّل (تین روپے پچیس پیسے) جلد دوم (تین روپے پچیس پیسے) جلد سوم (تین روپے)۔

سلیم کے نام خطوط — ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دل میں اسلام کے متعلق طرح طرح کے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ ان سوالات کا نہایت سادہ اور دل کش خطوط کے انداز میں جواب۔ مذہب گزیدہ نوجوانوں کو اسلام کی طرف لانے کے لئے بڑی کامیاب کوشش ہے۔ جلد اوّل (آٹھ روپے) جلد دوم (چھ روپے) جلد سوم (چھ روپے)۔

انسان نے کیا سوچا؟ — افلاطون سے لیکر اس وقت تک کے مختلف مفکرین۔ مورخین اور سائنسدانوں نے زندگی کے مسائل کے متعلق کیا کہا ہے۔ کیا وہ انسانی دنیا کی گتھیاں سلجھا سکے ہیں؟ یہ کتاب آپ کو سینکڑوں کتابوں سے بے نیاز کر دے گی۔ قیمت: بارہ روپے

نظام ربوبیت — انسانی زندگی کا پہلا مسئلہ روٹی کپڑے کا ہے۔ کیا یورپ یا روس کا نظام اس مسئلہ کا اطمینان بخش حل پیش کر سکا ہے؟ قرآن اس کا کیا حل پیش کرتا ہے۔ معاشی دنیا کی انقلاب آفریں کتاب ہے۔ (چار روپے)

ابلیس و آدم — آدم۔ ملائکہ۔ ابلیس۔ شیطان۔ جنات۔ وحی۔ نبوت کے متعلق قرآنی تصورات۔ (آٹھ روپے)

من و یزداں — خدا کیا ہے۔ انسان کیا ہے۔ ان دونوں کا تعلق کیا ہے۔ تقدیر کسے کہتے ہیں۔ دعا کا مفہوم کیا ہے۔ (دس روپے)

برق طور — صاحب ضرب کلیم اور فرعون کی آویزش۔ بنی اسرائیل کے عروج و زوال کی داستان، جو یوں کہئے کہ خود ہماری داستان ہے۔ (چھ روپے)

شعلہ مستور — حضرت عیسیٰؑ کی بصیرت افروز داستان حیات۔ کیا آپ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے؟ کیا آپ ابھی تک زندہ ہیں؟ کیا آپ دوبارہ تشریف لائیں گے؟ (چھ روپے)۔

سلسبیل — پروفیسر صاحب کے خطابات اور مقالات کا فکر انگیز مجموعہ۔ (آٹھ روپے)

فجر الاسلام
ضحی الاسلام — مصر کے نامور مؤرخ علامہ احمد امین (مرحوم) کی معرکہ آراء تصانیف کا اردو ترجمہ۔ زمانہ قبل از اسلام سے لیکر شباب اسلام تک کی تحقیقاتی داستان۔ ان کتابوں نے عالم اسلام میں بڑی شہرت حاصل کی ہے۔ (فجر الاسلام (آٹھ روپے) ضحی الاسلام (پانچ روپے)

الفتنۃ الکبریٰ — مصر کے شہرہ آفاق (نابینا) مؤرخ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی شہرہ آفاق کتاب کا اردو ترجمہ۔ عہد حضرت عثمانؓ کے خونچکاں مرقع کا پس منظر اور اس کے اسباب۔ ان واقعات کا ذمہ دار کون تھا؟ (چھ روپے)۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ ۲۵/بی۔ گلبرگ۔ لاہور

Regd. L. No. 7243

MONTHLY TOLU-E-ISLAM LAHORE

پرویز صاحب کی عمر بھر کی قرآنی فکر کا ماحصل

انقلاب انگیز کتابیں

انسان نے کیا سوچا؟

کیا تنہا عقلِ انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت کرسکتی ہے؟ اس اہم اور پیچیدہ سوال کا جواب یونان کے فلاسفروں سے لے کر ہمارے زمانے کے مفکرین اور سائنسدانوں نے کیا دیا ہے؟ یہ کتاب آپ کو سینکڑوں کتابوں سے مستغنی کردے گی۔ بڑی تقطیع خوبصورت ٹائپ۔ عمدہ سفید کاغذ مجلد (بارہ روپے)

سلیم کے نام خطوط

ہمارا تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ ایک عجیب کشمکش میں گرفتار ہے اسلام کے متعلق اسکے دل میں سینکڑوں شکوک اور شبہات پیدا ہوتے ہیں لیکن اسے ان کا کہیں سے اطمینان بخش جواب نہیں ملتا۔ جب وہ اس طرح مذہب سے متنفر ہوجاتا ہے تو ہم اسے کوسنے لگ جاتے ہیں۔ اُسے کوسنے نہیں۔ یہ کتاب دیجئے اور پھر دیکھئے کہ وہ کس طرح صحیح اسلام کا گرویدہ ہوجاتا ہے۔ خطوط کا انداز بڑا دلکش اور ہلکا پھلکا ہے۔ خوبصورت ٹائپ۔ عمدہ کاغذ۔ مجلد پہلی جلد۔ آٹھ روپے دوسری و تیسری جلد (چھ روپے فی جلد)

لغات القرآن

یہ قرآنی الفاظ کی صرف ڈکشنری نہیں۔ یہ ان کا مستند اور واضح مفہوم پیش کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان الفاظ سے قرآن کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے۔ اس کی تعلیم کیا ہے۔ اسکی دعوت کیا ہے۔ قرآن نے انسان کو کیا دیا ہے۔ یہ اس کا مقام کیا متعین کرتا ہے چار جلدوں کی یہ کتاب قرآنی حقائق اور علوم حاضرہ کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ خوبصورت ٹائپ۔ عمدہ سفید کاغذ۔ خوبصورت جلد پہلی تین جلدوں کی قیمت پندرہ روپے فی جلد چوتھی جلد بارہ روپے۔ مکمل سیٹ پچپن روپے ہیں۔

عہد آفریں کتابیں

بصیرت افروز کتابیں

سلسبیل

پرویز صاحب کے خطبات اور مقالات نے ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کے دل و دماغ میں عجیب خوشگوار انقلاب پیدا کردیا ہے۔ سلسبیل انہی خطبات و مقالات کا دلکش مجموعہ ہے جس میں زندگی کے مختلف گوشے اُبھر کر سامنے آگئے ہیں۔ ایسی کتابیں عہد آفریں ہوتی ہیں۔ کتابت طباعت کاغذ عمدہ قیمت مجلد آٹھ روپے

اسلام کیا ہے

یہ مسائل کی کتاب نہیں۔ یہ آپ کو بتائے گی کہ اسلام کے بنیادی تصورات کیا ہیں۔ وہ کس قسم کا معاشرتی۔ معاشی سیاسی نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کی رُو سے انسانی پیدائش کا مقصد کیا ہے اور اسکی غرض و غایت کیا۔ اور معاشرہ میں عورت کا صحیح مقام کیا ہے۔ (قسم اعلیٰ۔ آٹھ روپے) (حبیبی ایڈیشن۔ چار روپے)

معلومات افزا کتابیں

ناظم ادارہ طلوع اسلام — ۲۵/بی۔ گلبرگ — لاہور

Regd. L. No. 7243

MONTHLY TOLU-E-ISLAM LAHORE

بہارِ نو

شائع کردہ: ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵/بی - گلبرگ - لاہور